

# شماره

سعادت حسن مثنو

مکتبہ شاہزادی

www.taemeernews.com

پیغمبر



پینا بازار



سعادت حسن بنوٹ



مکتب عشیا احمدیہ

## (جمد حقوق بحق پبلیش محفوظ ہیں)

جون ۱۹۵۳ء  
دور دے پے چار آنہ

پہلی بار  
قیمت

بیونین پرنس دھلی



# فہرست

۹

کلڈ پپ کور

۲۳

نرگس

۳۱

چھمیاں کی بیٹی پری چہرہ نیم

نا آشنا سے محبت،

۶۱

اشوک کمار

تاجی کے شیام

۸۹

دکیل صاحب

۱۲۱

دی مارچ۔ دسائی

۱۳۹

ستارہ



# کلڈیپ کور پہ پہ

یہ اُس مشہور ایکٹر نیں کا نام ہے جو ہندوستان کی متعدد فلموں میں آ چکی ہے۔ اور آپ نے یقیناً اُس سے پردے پر کئی دنہ دیکھا ہو گا۔ میں جب بھی اُس کا نام کسی نلم کے اشتبہار میں دیکھتا ہوں۔ تو میرے تصور میں اُس کی پوری شکل بعد میں لیکن سب سے پہلے اُس کی ناک ابھرتی ہے۔ تبھی۔ بہت تبھی ناک اور پھر مجھے بھتی ٹاگز کادہ دلپ پ داقعہ یاد آ جاتا ہے۔ جو میں ابھی بیان مگرنے والا ہوں۔

ٹوارے پر جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے۔ تو کلڈیپ کو رجو کے لاہور میں تھی اور وہاں فلموں میں کام کر رہی تھی، بھرت کر کے بھئی ٹلی آن لڈ اُس کے ساتھ اُس کا داشتہ پران بھی تھا جو پتوں کی کئی فلموں میں کام کر کے شہر ق ماحصل کر چکا تھا۔

اب پران کا ذکر آیا ہے تو اُس کے متعلق بھی چند تعارفی سطور لکھنے میں

کوئی مفائد نہیں پر ان اچھا خاص خوش شکل مرد ہے۔ لاہور میں اُس کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ بڑا ہی خوش پوش اسک تھا۔ بہت لمحات سے رہتا تھا۔ اُس کا ٹانگہ گھوڑا لاہور کے ریسی ٹانگوں میں سے سب سے زیادہ خوبصورت اور لمحش تھا۔ مجھے معلوم نہیں پر ان سے کلدیپ کو کی دستی کب اور کس طرح ہوئی۔ اس لئے کہ میں لاہور میں نہیں تھا بلکن فلمی دوستیاں عجائب میں افل ہیں۔ وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ایک مدرسون کا دوستانہ بیک وقت کی مرد ڈال سے ہو سکتا ہے جو اس فلم سے وابستہ ہوں۔

جن دنوں پر ان اور کلدیپ کو رکامعاشرہ چل رہا تھا۔ ان دنوں شام مرحوم بھی وہیں تھا۔ پونہ اور بھئی میں قمت آزمائی کرنے کے بعد وہ لاہور پلا گیا تھا جس سے اُس سے والہانہ محبت تھی۔ عشق پریشہ انسان تھا۔ اور کلدیپ بھی اس میدان میں اُس سے پچھے ہنیں تھی۔ دو نوں کا تھا درم ہوا۔ قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائے کر ایک اور اڑکی شیام کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ اس کا نام متاز تھا جو تماجی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ زیب قریشی ایم اے کی چھوٹی بہن تھی۔ کلدیپ کو شیام کی یہ قلا بازی پسند نہ آئی۔ مچنا پچھ وہ اُس سے ناراض ہو گئی اور ہمیشہ ناراض رہی۔ میردہاں آپ کو یہ تبا دوں کہ کلدیپ بڑی ہیلی ہوت ہے۔ جو بات اُس کے دماغ میں سما جائے اس پر اڑکی رہتی ہے میں آپ کو ایک وہ سچپ بات بتاؤں۔ یہ واقعہ بھئی کا ہے۔

ہم تینوں بھئی ٹائکر میں تھے۔ اور شام کو بر قی ٹین سے اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ فرست کلاس کا ڈبہ اُس دن قریباً قریباً ظالی تھا۔ یعنی ہم تینوں

کے سوا اُس میں اور کوئی معاذنة تھا۔

شیام طبعاً بڑا لمبند بانگ اور مُخچھٹ تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ کپارٹمنٹ میں کوئی غیر نہیں تو اُس نے کلدیپ کو رسمی طور پر خانی شروع کر دی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ رشتہ جو لاہور میں قائم تھے ہو سے رہ گیا تھا اب یہاں بھی میں قائم ہو جائے کیونکہ تابی سے اُس کی کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ رولا کلکتہ میں تھی اور نگار سلطانہ نعمہ نویں مدھوک کے پاس وہ ران دنوں بقول اُس کے "فالی ہاتھ" تھا۔

چنانچہ اُس نے کلدیپ کو رسمی طور پر کہا کے، کے ملتمم مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو یا دھر آؤ میری جان میرے پاس بیٹھو۔ کلدیپ کی ناک اور تسلیم ہو گئی۔

"شیام صاحب، آپ مجھ پر ذور سے نہ ڈالیں" میں اُن کی گفتگو جو بچھے مکمل طور پر یاد ہے۔ یہاں نقل کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ وہ بہت بیساک تھی۔ ویسے اُس کی روح اپنے لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں۔ شیام کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اُس کے ہر نقطہ میں ایک قہقہہ ہوتا تھا۔ اُس نے کلدیپ سے اُسی مخصوص انداز میں کہا۔ "جان من یا اُس اُتو کے پٹھے پران کو چھوڑ دو۔ اور میرے ساتھ تاما جوڑو، وہ میرا دوست ہے، لیکن یہ معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔"

کلدیپ کو رسمی آنکھیں اُس کی ناک کی طرح بڑی اور تسلیمی ہیں۔ اُس کا بدمان بھی بڑا تھا ہے۔ اُس کے پھرے کا پر خود خال تیکھا ہے۔ جب وہ اپنی

بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر بات کرتی ہے تو آدمی یوکھا ل جاتا ہے۔ کہ یہ کیا  
میختہ ہے۔

اُس نے تیر تیر نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھا۔ اور اُس سے زیادہ  
تیر پہنچ میں اُس سے کہا: ”مخدود صور رکھنے شیام صاحب“  
شیام پر عورتوں کی تیر کفتاری کا بجلا کیا اثر ہوتا۔ اُس نے ایک قہقہہ لکھایا  
اور کہا کہ ”میری بان تم لا ہو رہیں مجھ پر مر قی تھیں؛ یا دہنیں لمہنیں؟“  
اب کلدیپ نے قہقہہ لکھایا جس میں نسوانی طنز بھرا تھا۔ ”آپ کو  
وہم ہو گیا تھا۔“

شیام نے کہا تم غلط کہتی ہو، تم یقیناً مجھ پر مر قی تھیں۔

میں نے کلدیپ کی طرف دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اُس کے جسم میں  
سپردگی کی خواہش موجود ہے۔ مگر اُس کا ٹیڈیلا دماغ اس کی اس خواہش کو  
رد کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی تیکھی پلیکن پھر پھرا  
کر کہا: ”مر قی تھی لیکن اب ہنیں مر دیں گی؟“

شیام نے اپنے اسی لا بالہانہ انداز میں کہا۔ اب ہنیں مر دگی تو کل  
مر دگی۔ مرتباً بہر حال ہمیں مجھ پر ہی ہے

کلدیپ کو رہنا گئی۔ ”و شیام تم مجھ سے آخری بار سن لو کہ مہارا  
میرا کوئی سلسلہ نہیں ہو سکتا۔ تم اڑاتے ہو، ہو سکتا ہے لا ہو رہیں کبھی میری  
طبیعت تم پر آئی ہو۔ لیکن جب تم نے بے رُخی بر تی۔ تو میں کیوں ہمیں منہ لکھوں  
اب اس قہقہہ کو ختم کر دو۔“

قصہ ختم ہو گیا۔ صرف وقتی طور پر۔ کیونکہ شام زیادہ بحث کی بحث کا عادی نہ تھا۔

کلدیپ کو راٹاری کے ایک شہر و معروف اور مالدار سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ایک فرد لاہور کی ایک شہر مسلمان عورت سے منلک ہے جس کو اُس نے لاکھوں روپیے دیتے۔ اور سنابے کے اب بھی دیتا ہے۔

یہ مسلمان عورت کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی۔ مگر اب موٹی اور بجدی ہو گئی ہے۔ مگر دہ اٹاری کے سکھ حضرت اب بھی با قاعدہ یہاں لاہور میں فلیٹ ہوٹل میں آتے ہیں اور اپنی مسلمان مجودیہ کے ساتھ چند روز گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔

جب بُوارہ ہوا تو کلدیپ کو راٹار پران کو افران فرنی میں لاپور چھوڑنا پڑا۔ پران کی موڑ (جو غالباً کلدیپ کو رکیت لھتی) یہیں رہ گئی۔ لیکن کلدیپ کو ایک یا تھسی عورت ہے۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مردوں کی اپنی سہیلوں پر نپا سکتی ہے۔ اس سے دہ کچھ دیر کے بعد لاہور آئی۔ اور فسادات کے دوران میں یہ موڑ پلا کر بھائی لے گئی جب میں نے موڑ دیکھی اور پران سے بچا کر یہ کب خریدی کھی ہے تو اُس نے مجھے سارا داقہ سنایا۔ کہ ”سے کے“ کے ”لاہور سے لیکر آئی ہے۔ اور یہ کہ راستے ہیں اُسے کوئی سمجھیں نہیں ہوتی۔ ایک صرف دلی بیس اُسے چند روز بھرنا پڑا کہ ایک گڑا بڑا ہو گئی تھی۔

جب وہ موڑ سے کر آئی تو اُس نے سکھوں پر مسلمانوں کے مظالم بیان

کئے اور اس انداز سے بیان کئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے سے مخفی لگانے والی چھری اٹھائے گی اور میرے پیٹ میں مگونپ دے گی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی۔ درستہ مسلمانوں سے کوئی عدالت یا بغضہ نہیں۔

اصل میں اُس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جو جسمانی لحاظ سے بڑی پر غلوص ہے۔

اُس کی ناک بیج دیکھی ہے۔ اُس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ اُس کا لب رہاں بہت باریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے چہرے پر ذرا سا پڑھا بہت تیز و تندر بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کا ہجہ اور اُس کی آداز بھی بیرونی طور پر تندر و طرار ہے۔

کلدیپ کو رکی تیکھی ناک کا ذکر میں کھی بار کر چکا ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ ایک رطیفہ من ہیجئے۔

میں فلمستان چھوڑ کر اپنے دوست اشوك کمار اور ساؤک داچا کے ساتھ بھئی ناکر چلا گیا تھا۔ اُس زمانے میں فعادات کا آغاز تھا۔ اُسی دوران میں کلدیپ کو را اور اُس کا داشتہ پرانا ملازمت کے لئے دہماں آیا۔

پرانے جب میری ملاقات شام کے توسطے سے ہوئی تو میری اُس کی فوراً ادوستی ہو گئی۔ بڑا بے بیا آدمی ہے۔ کلدیپ کو رے البتہ کچھ رسی قسم کی ملاقات رہی۔

ان دنوں تین فلم ہمارے اسٹڈیو میں شروع ہونے والے معنے چانپو

جب کلدیپ کور نے سردارک واپس سے ملاقات کی۔ تو انہوں نے جوزف داشنگ جو من کیروہ مینہ سے کہا کہ وہ اس کا کیروہ ٹیکٹ لے تاکہ ایمان ہو جائے۔

داشنگ کور سے رنگ اور ادھیر غر کامو ٹاما آدمی ہے۔ اس کو ہمان سورا سے مرحوم اپنے ساتھ بھی سے لائے تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اُسے دلولالی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصے تک وہاں رہا جب جنگ ختم ہوئی تو اُسے بہاکر دیا گیا۔ اور وہ پھر واپس بھی ٹاکیز میں آگیا اس لئے کہ مسٹر واپاہا سے اُس کے دو تاریخی تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ عرصہ ہوا بھی ٹاکیز میں اکٹھے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ان دونوں مسٹر واپاہا ریکارڈ ٹسٹ تھے۔

داشنگ نے اسٹڈیو میں روشنی کا انتظام کرایا اور میک اپ میں سے کہا کہ وہ کلدیپ کور کو تیار کر کے کیروہ ٹیکٹ کے لئے لائے۔ وہ خود تیار تھا۔ کیروہ نیا تھا۔ اُس کو اُس نے اچھی طرح دیکھا۔ روشنیاں درست کرائیں اور اپنا پڑھ سلکائے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کلدیپ کور آئی۔ میں نے اُسے دیکھا۔ اُس کی ناک پر میک اپ میں نے صرفی اور سفیدیے کے کچھ ایسے خط لگانے تھے کہ وہ دس گنا اور تیکھی ہو گئی تھی۔ جب داشنگ نے اُس کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ کیونکہ وہ صرتا پانک تھی۔

کلدیپ کور، بالکل بے خوف، بے جھک کیروہ کے سامنے کھڑا ہی

ہو گئی۔ درشنگ نے اُس کو اپ کھیرے کی آنکھ سے دیکھا۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کو بڑی اٹھجن ہو رہی ہے۔ وہ اُس کی ناک اپنے زاویے پر بھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میوب معلوم نہ ہو۔

بیچارہ اس کو شش میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر اُس نے تک ہار کے مجھ سے کہا میں اب ایک کپ پا سے پیوں گا؛ میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ پھر اپنے ہم دونوں کیٹھن میں پلے گئے۔ وہاں اُس نے اپنا پسینہ پوچھتے ہوئے بجھ سے کہا۔ ”مسٹر منٹو۔ اس کی ناک بھی ایک آفت ہے۔ میکھر سے میرا ٹھسی چلی آتی ہے۔ پھرہ بعد میں آتا ہے ناک پہلے آتی ہے۔ اب میں کیا کروں۔ پچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔ بعد تم جانو تمہارا کام جانے“ پھر اُس نے ایک اور اٹھن کا انہمار کیا۔ لیکن درجہ بندی سے کان میں۔ ”مسٹر منٹو۔ اُس کا وہ معاملہ کوٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں اُس سے سچے کہو۔“ اور یہ کہہ کر میں درشنگ نے اپنے ماتحتے کا پسینہ پوچھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن درشنگ نے پھر بھی مجھے دفاحت سے سب کچھ بتا دیا۔ اور مجھ سے درخواست کی کہ میں کے لئے کے سے درخواست کر دیں کہ وہ اس معاملے کوٹھیک کر دے، کہ وہ بہت ضروری ہے۔ باس کا دہ کوئی نہ کوئی زاویہ نکال لے گا۔ مگر اس معاملے سے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیا یہ اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی تشکی کی کہ میں سب کچھ کر دوں گا۔ کیونکہ اس نے مجھے اس معاملے کی درستی کا حل بتا دیا تھا کہ چونیں

روپے میں واٹ دے اینڈ یہ لاکی دوکان سے دستیاب ہو سکتا ہے۔  
 اس روز ٹیکٹ کی بہانے موقوف کر دیا گیا۔ کلدیپ جب اسٹڈی یو ہے باہر  
 نکلی تو میں نے بے تکلفی سے ساری بات جو اس معاملے کے متعلق تھی بتا دی اور اس سے  
 کہا کہ وہ آج ہی فورٹ میں جا کر وہ چیز خرید لے جس سے اس کے حجم کا تقصی دو رہو  
 جائیں گا۔ اس نے بلا جھگک میری بات سنی اور کہا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے چنانچہ وہ  
 اُسی وقت پران کے ساتھ گئی اور وہ چیز خرید لائی۔ جب دوسرے روز اسٹڈی یو  
 میں اس سے ملاقات ہوئی تو زین و آسمان کا فرق تھا یہ چیزیں ایجاد کرنے والے  
 بھی بلا کے آدمی ہیں جو پوں چنکیوں میں ”معاملوں“ کو کہاں سے کہاں پہنچا  
 دیتے ہیں۔

ورشنگ نے جب اُسے دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ کو کلدیپ کی ناک اُسے نگ کر رہی  
 تھی، مگر اب دوسرا معاملہ بالکل ٹھیک تھا۔ چنانچہ اُس نے ٹیکٹ لیا اور جب اس کا  
 بندش تیار ہوا اور ہم سب نے اُسے اپنے پر جگہن ہال میں دیکھا تو اُس کی شکل و صورت  
 کو پنڈ کیا اور یہ را نے متفقہ طور پر قائم ہوئی کہ وہ خاص بوز کے لئے بہت اچھی  
 رہے گی۔ خصوصاً دیپ دوں کے لئے۔ کلدیپ کو رے مجھے زیادہ ملنے جلنے  
 کا اتفاق نہیں ہوا۔ پران چونکہ دوست تھا اُس کے ساتھ اکثر شامیں گذرتی تھیں اس  
 لئے کلدیپ بھی بھی بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھیں۔ وہ ایک ہوٹل میں رہتی  
 تھی جو ساحل سمندر کے پاس تھا۔ پران بھی اس سے کچھ دور سکول میں مقیم تھا جہاں  
 اُس کی بیوی اور بچہ بھی تھا لیکن اُس کا زیادہ وقت کلدیپ کو رے کے ساتھ گزرتا  
 تھا۔ میں اب آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنا تما ہوں۔

میں اور شام تا جہوں میں بیڑ پہنچے جا رہے تھے کہ راتے میں مشہور نعمت نے اس  
مدھوک سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمیں "ایر دس سینا" کی بار میں لے گئے۔ وہاں ہم  
سب تک بیرنوٹی میں شمول رہے۔ مدھوک ٹیکیوں کا بادشاہ مشہور رہے۔ باہر  
ایک گراند میل سیکی کھڑی تھی یہ مدھوک صاحب کے پاس تین دن رہے تھی۔

جب ہم فارغ ہوئے تو انہوں نے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ مدھوک صاحب  
کو اپنی محبوہ نگار سلطانہ کے پاس جانا تھا۔ جس سے کسی زمانے میں شیام کا بھی تعلق تھا۔  
اور کلدیپ کو رحمی اُس کے آس پاس ہی رہتی تھی۔ شیام ذمہ سر کہا پڑو پر ان سے  
لئے ہیں۔

چنانچہ مدھوک صاحب کی ٹیکی میں بیٹھ کر دہائی پہنچے، وہ تو اپنی نگار سلطانہ  
کے پاس پہنچے گئے اور ہم دونوں کلدیپ کو رے کے ہیں۔ پران دہائی بیٹھا تھا۔ ایک  
خنقر سا کمرہ تھا۔ بیڑ پی ہوئی تھی۔ بنزو دگی طاری تھی۔ اس کو زائل سرنے کے لئے  
شیام نے سوچا کہ تاش کھیلنی چاہیے۔ کلدیپ فوراً تیار ہو گئی۔ لیکن یہ کہا فلشن ہو گی  
ہم مان گئے۔

فلشن شروع ہو گئی۔ کلدیپ کو را اور پران ایک ساتھ تھے۔ پران ہی پتے  
بانٹتا تھا۔ وہی اٹھا تما تھا۔ اور کلدیپ کو اُس کے کا نزد ہے کے ساتھ اپنی توہینی  
ٹھوڑی ٹھکائے بیٹھی تھی۔ البتہ جتنے روپے پران جیتا تھا انہا اٹھا کر اپنے  
پاس رکھ لئی۔

اس کھیل بیم ہم صرف ہارا سکئے میں نے فلشن کئی مرتبہ کھیلی ہے۔ لیکن وہ  
فلشن کچھ عجیب و غریب قسم کی تھی۔ میرے پھپتر دھپے پدرہ منت کے اندر انہیں

کلدیپ کور سے پاس لئے۔ میری سمجھیں نہیں آتا تھا کہ آج پتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹھانے کے آتے ہی نہیں۔

شیام نے جب یہ رنگ درکھا تو مجھ سے کہا۔ ”منٹوا بند کرو“  
میں نے کھینا بند کر دیا۔ پران مسکرا یا اور اس نے کلدیپ سے کہا۔  
”کے پیے واپس کر دنٹو صاحب کے“

میں نے کہا ”یہ غلط ہے۔ تم لوگوں نے بھیتے ہیں۔ واپسی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟“ اُس پر پران نے مجھے بتایا کہ وہ اول درجے کا نو سرپارز ہے اُس نے جو کچھ بتایا ہے اپنی چاکدستی کی بد دلت مجھ سے بتایا ہے۔ چونکہ میں اُس کا دوست ہوں اس لئے وہ مجھ سے دھوکا کرنا نہیں چاہتا۔ میں پہلے سمجھا کہ وہ اس چیلے سے میرے روپے واپس کرنا پاہتا ہے۔ لیکن جب اُس نے تاش کی گڈی اٹھا کر تین چار بار پتے تقسیم کئے اور ہر بار بڑے راؤ بھیتے والے پتے اپنے پاس گراۓ تو میں اُس کے تھکنڈے کے قابل ہو گیا۔ کام واقعی بڑی چاکدستی کا ہے پران نے پھر کلدیپ کور سے کہا کہ وہ روپے واپس کر دے۔ مگر اُس نے انکاڑ کر دیا۔ شیام سمجھا بہو گیا۔ پران ناراض ہو کر چلا گیا غالبًاً سے اپنی یہوی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ شیام اور میں دہی بھیتے رہے تھوڑی دیر شیام اُس سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اُس نے کہا آدم طویل کر دیا۔ کلدیپ راضی ہو گئی۔

میکسی ننگوائی سگی۔ ہم سب بائی کھلہ روانہ ہوئے۔ میکر بودھ پر میرا فلیٹ تھا۔ ہم سیدھے دہاں پہنچنے۔ گھر میں ان دونوں کو فی بھی نہ تھا۔ شیام میرے

ساختہ رہتا تھا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو شام نے کلڈپ سے جھیر خانی شروع کر دی۔ کلڈپ بہت چلتا گ آنے والی عورت ہیں۔ وہ کسی مرد سے گھبرا تی بھی نہیں۔ اُس کو خود پر پورا پورا اعتماد ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک شام کے ساختہ سنتی کھللتی رہی۔

ماں میں یہ بتانا بھول گیا کہ جب ہم کلڈپ روپے پہنچے تو کلڈپ نے نکاری لگانے کے لئے کہا کہ وہ سینٹ کی شیشی خریدنا پڑا ہتی ہے۔ شام سخت کہا ب تھا کہ وہ اُس روپے سے ہر چیز خرید سے گا جو پرانے نوسرا بازی سے بھجے سے بیتے تھے۔ پر میں نے اُس سے کہا کوئی ہرج نہیں۔ تم اس بات کا کچھ جمال نہ کرو۔ ہشاد اس قہہ کو۔ کلڈپ کے ساختہ میں اسٹوریں گیا۔ اُس نے بار بار سے ہا سینٹ پسند کیا۔ اُس کی قیمت بائیس روپے آٹھ آنے لگتی۔ کلڈپ نے خوبصورت شیشی اپنے پر سلیں رکھی اور بھجے سے کہا۔ ”منٹو صاحب اقیت ادا کر دیجئے۔“

میں اس سینٹ کے دام ہرگز ادا کرنائیں چاہتا تھا مگر وہ کانڈار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے بھجے سے قیمت ادا کرنے کے لئے کہا تھا کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا پاعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے روپے نکالے اور روپے ادا کر دیئے۔ فلیٹ میں جب شام کو معلوم ہوا کہ سینٹ میں نے خرید کر دیا ہے۔ تو وہ آگ بگو لا جاؤ گیا۔ اُس نے بھجے اور کلڈپ کو پیٹ میر کے گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں زرم ہو گیا۔ اُس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلڈپ کسی نہ کسی طرح رام ہو جائے۔ میں نے بھی کوشش کی اور کلڈپ کو رسو سمجھایا کہ اب ان کے اختلافات مٹ جانے چاہیں۔ کلڈپ مان گئی۔ میں نے

شام اور اس سے کہا میں جاتا ہوں۔ تم دنوں آپس میں فیصلہ کر لو۔ مگر اس نے کہا کہ نہیں۔ یہ سمجھوتہ راس کے ہوٹل میں ہو گا۔ میکسی نیچے کھڑی تھی دنوں اس میں پڑے گئے۔

میں خوش تھا کہ ٹپٹیہ قصہ ملے ہوا۔

مگر پون گھنٹے بعد ہی شام لوقت آیا۔ سخت غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو جب برا نڈی کا گلاس پیش کیا۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ زخمی ہے۔ خون بہر لام ہے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا۔ وہ کہا ب تھا۔ لیکن برا نڈی نے اس سے کوئی کوئی قدر درست کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ ”کے کے“ کے ساتھ وہ اس سے ہوٹل میں ہنچا اور وہ میکسی سے باہر نکلے تو وہ (کلڈیپ) کو گالی دے کر منکر بوجائی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ ہم دنوں ایک پھر میں دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم لاہور میں مجھ پر مری تھیں اب یہ کیا نظر ہے۔ اس نے جواب میں کچھ ایسی بات کہی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تان سر گھونسا مارا۔ مگر وہ ایک طرف ہٹ گئی اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جاؤ سکریا۔ وہ ہنسنے، ہیچے لگاتی۔ اور ہوٹل میں چلی گئی۔ اور میں کھڑا اپنا زخمی ہاتھ دیکھا رہ گیا۔

پھر اس نے اپنی پیلوں کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سینٹ کی شیشی نکالی۔ ”روپے تو میں اس سے واپس نہیں لے سکا۔ لیکن یہ سینٹ کی شیشی لے آیا ہوں۔“

کلڈیپ کو رعبیں و غریب شخصیت کی ماں کہے۔ جس طرح اس کی

ناک تشکیلی ہے۔ اسی طرح اس کا کردار تیکھا اور نوکیلا ہے۔  
پھر پہلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ اس پر مندوستان میں پاکستان کی جاسوس  
پوزنے کا اذنا م لکایا گیا ہے معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے  
لیکن میں دُوق سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی عورت "ماتاہری"  
بھی نہیں بن سکتی جس کا ظاہر و باطن ایک ہو۔

# مگس

بیں فلستان میں ملازم تھا۔ صحیح جاتا تورات کو آٹھ سے قریب ٹوٹتا۔ ایک  
ندزاً تفاق سے داپسی جلدی ہوئی۔ یعنی میں درپیڑہی کے قریب گھر پہنچ گیا  
اندر داخل ہوا تو ساری فضای امتعش نظر آئی جیسے کوئی ساز کے تار پھیر ڈس کر خود  
چھپ گیا ہے۔ ڈرنسگ ٹیبل کے پاس میری دوسالیاں کھڑی بسطا ہر  
لبنے بال گوندھو رہی تھیں۔ محرّک آن کی آنکھیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں  
کے پھر پھردار ہے تھے۔ محرّک آداز تھیں تھیں۔ دونوں مل جل کر گھبراہٹ  
کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں۔ جو اپنی گھبراہٹ پھپانے کی خاطر بے مطلب  
درپیڑا درٹھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ملختہ کمرے کے دروازے کا پردہ  
اندر سے دبایا ہوا تھا۔

بیں صوفی پر بیٹھ گیا۔ دونوں یہنوں نے ایک دوسرے کی طرف  
قصوداً رنگا ہوں سے دیکھا۔ ہولے ہولے سے کھسپھر کی۔ پھر دونوں

نے بیک وقت کہا۔ ”بھاجی سلام“  
 ”وعلیکم السلام“ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟“  
 میں نے سوچا کہ سب مل گر سینا جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال من کر  
 پھر کھرپسرا کی۔ پھر ایک دم مکھ لکھلا کر بٹھا اور دوسرے کمرے میں بجا گئیں۔  
 میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدخو کیا ہے، وہ آنے والے  
 ہے اور پھر مجھ میں غیر متوقع طور پر چلا آیا ہوں اس لئے ان کا پرد ڈگرا مدرہ ہم برہم  
 ہو گا ہے۔

دوسرے کمرے میں کھدری رک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ پہلی  
 دبی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری  
 بیوی بنتا ہر اپنی بہنوں سے مخالف، مگر دراصل مجھے نہانے کے لئے کہتی  
 ہوئی باہر نکلی۔ ”مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود ان سے کہو..... معاوضت  
 صاحب آج بہت جلدی آگئے ہے“

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹڈیو میں کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے  
 چلا آیا۔ پھر اپنی بیوی سے پوچھا۔ ”کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیاں؟“  
 ”یہ کہنا چاہتی ہیں کہ زنگس آرہی ہے۔“

”تو کیا ہوا آئے۔ وہ کیا پہلے کبھی نہیں آئی۔“

میں سمجھا کہ وہ اس پارسی راستی کی بات کر رہی ہے۔ جس کی ماں نے ایک  
 مسلمان سے شادی کر لی تھی۔ اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری  
 بیوی نے کہا۔ ”ہم نے وہ پہلے کب ہمارے ہاں آئی پے؟“

”تو کیا وہ کوئی اور زگس ہے؟“

”میں زگس ایکٹریس کی بات کر رہی ہوں“

میں نے تجھ سے پوچھا۔ ”وہ کیا کرنے آرہی ہے یہاں؟“

میری پیسوی نے مجھے سارا قصہ سنایا۔ لگھر میں ٹیلیفون تھا۔ جسے تینوں بہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراضی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلوں سے باتیں کرتے کرتے تھک چاتیں تو کسی ایکٹریس کا نمبر لگھا دیتیں۔ وہ مل جاتی تو اُس سے اٹپٹپانگ گفتگو شروع ہو جاتی۔ ہم آپ کی بہت مذاح ہیں۔ آج ہی ولی سے آئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ ملاقات کرنے کے لئے ترک رہی ہیں۔ ضرور حافظہ ہوتیں مگر پردے کی پابندی ہے۔ آپ بہت حسین ہیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاپ۔ کلام اشارہ دے رہی سریلا ہے۔ حالانکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں امیر بائی بولتی ہے (اششاد)

عام طور پر مشہور فلم ایکٹریوں کے نمبر ڈائرکٹری میں درج نہیں ہوتے۔ وہ خود نہیں کہتے کہ ان کے چاہئے والے بیکار نگ نہ کریں۔ مگر ان تینوں بہنیوں نے میرے دوست آغا ظلش کا شیری کے ذریعے سے قریب قریب ان تمام ایکٹریوں کے نمبر حاصل کر لئے تھے جو اخیں ڈائرکٹری میں نہیں لئے تھے۔ اس ٹیلیفونی شغل کے دوران میں جب اُہنوں نے زگس کو ٹبلایا اور اُس کے بات چیت کی۔ تو بہت پند آگئی۔ اس گفتگو میں ان کو اپنی عرض کی آواز نہیں دی۔ ۔

وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ مگر اپنی اصلیت پھپائے رکھی۔ ایک کھنٹی میں افریقیہ کی رہنے والی ہوں۔ وہ دوسری بار یہ تبلاق کہ الحنفیوں سے اپنی غالہ کے پاس آئی ہے۔ دوسری یہ ظاہر کرتی کہ وہ راد پنڈی کی رہنے والی ہے اور صرف اس لئے بھی آئی ہے کہ اسے زگس کو ایک بار دیکھنا ہے۔ تیسرا یعنی میری یوں کبھی گجرات بن جاتی کبھی پارسن۔

ٹیلیفون پر کھنٹی بار زگس نے جھنجلا کر پوچھا کہ تم لوگ اصل میں کون ہو گیوں اپنا نام پڑھ پھاتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتائیں کہہ روز روکی ٹھنڈھن ختم ہو۔“

ظاہر ہے کہ زگس اُن سے متاثر تھی۔ اس کو یقیناً اپنے سینکڑاں مذاہل کے فون آتے ہوں گے مگر یہ تین راتیاں اُن سے کچھ مختلف تھیں۔ اس لئے وہ سخت بے چین تھی۔ کہ اُن کی اصلیت جانے اور اُن سے ملے جلے اچانک جب بھی اسے معلوم ہوتا کہ ان پر اسرار رکھیوں نے اُسے بلایا ہے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی۔ اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ پرچکی رہتی۔

ایک دن زگس کے پیغم اصرار پر بالآخر طے ہو گیا کہ اُن کی ملاقات ہو کے رہے گی۔ میری یوں نے اپنے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ملنے میں وقت ہو تو باقی کھلہ کے پل کے پاس کسی ہوٹل سے ٹیلیفون مردیا جائے۔ وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب تھیں گھر میں داخل ہوا۔ باقی کھلہ پل کے ایک اسٹور سے زگس نے فون کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے مگر مکان نہیں مل رہا۔ پھر اپنے تینوں افراتفری

کے عالم میں تیار ہو کر چھپنے کے میں بلائے ناگہانی کی طرح کوئی سمجھا  
چھوٹی دو کا خیال تھا تھا میری پیشی میری بیوی مخف بکھا  
ہوئی تھی۔ کہ یہ سب کیا ہوا ہے — میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر  
مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قصہ کافی دلچسپ اور بجد مقصود  
تھا۔ اگر ”مکان پھولی“ کی یہ حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہونی ہوتی۔ تو  
پا لکھ جدابات تھی۔ ایک سالی آدھی گھروالی ہوتی ہے اور یہاں دوسرا یا  
تھیں۔ پورا گھر ہی اُن کا تھا۔ میں جب اٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے  
اور تماں بجا نے کی آدازیں بلند ہوئیں۔

بافی کھلہ سکر جوک میں جدن بائی کی لمبی چورڑی مورکھڑی تھی۔ میں نے  
سلام کیا۔ تو اُس نے حسب معمول بڑی بلند آواز میں اُس کا جواب دیا اور پوچھا  
”وہ کہہ منٹو کیسے ہو۔“

ہلنسے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے — کیسے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔“

جدن بائی نے پچھلی نشست پر بیٹھی ہوتی زنگس کی طرف ریکھا۔ ”کچھ نہیں  
بے بی کو اپنی سیلیوں سے ملتا تھا۔ مگر ان کا مکان نہیں بل رہا۔“

میں نے مُسکرا کر کہا۔ ”چلنے میں آپ کو لے چلوں۔“

زنگس یہ سُن کر کھڑکی کے پاس آئی۔ ”آپ کو ان کا مکان معلوم ہے؟“  
میں نے اور زیادہ مُسکرا کر کہا۔ ”اپنا مکان کون بھول سکتا ہے۔“  
جدن بائی کے ہلق نے عجیب سی آواز نکالی۔ پان کے پڑے کو دوسرے  
کھلے میں تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم کیا افسانہ نگاری کر رہے ہو۔“

میں دروازہ کھول کر چدن بائی کے پاس بیٹھ گیا۔ ”بی بی! ایہ افسانہ تھاری میری نہیں ہے۔ میری یوں اور اس کی بہنوں کی ہے“ اُس کے بعد میں نے فتحر ا تمام واقعات بیان کر دیئے۔ نگسڑی پچپی سے سنتی رہی۔ چدن بائی کو بہت کوت ہوئی۔ ”لا حول ولا..... یہ کسی رٹکیاں میں پہلے ہی دن کہہ دیا ہوا کہ ہم منظہ کے گھر سے بول رہی ہیں۔ خدا کی قسم میں فوراً پہلے بل کو بیٹھ دیتی بھئی صد ہو گئی ہے اتنے دن پر بیٹان کیا..... خدا کی قسم بچاری بے بی کو آتی الگ ہوتی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں۔ جب ٹیکھوں آتا تو بھاگی بھاگی جاتی میں ہزار بار پوچھتی یہ کون ہے جس سے آنی دیر بیٹھی بیٹھی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھے کہتی کہ یونہیں جانتی نہیں کون ہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک باری سے نے میلیوں اٹھایا۔ گفتگو ما شا، اللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر مونا کرنا۔ کم بجت لپنا نام پر صاف بتانی ہی نہیں تھیں۔ آج بے بی آئی اور خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔ بی بی! اُنہوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ پاگل ہوئی ہو۔ ہموجانے کوں ہیں۔ کوں نہیں ہیں۔ پر اُس نے میری ایک نہ مانی۔ بس پچھے پڑ گئی۔ چنانچہ بچھے ساتھ آنا ہی پڑا۔ خدا کی قسم اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہ آفیس تھا۔ گھر کی ہیں.....“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”تو ساتھ آپ نازل نہ ہوئیں؟“

چدن بائی کے کلے میں دبے ہوئے پان میں چوڑی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ”اس کی فرورت ہی کیا تھی۔ میں کیا تھیں جانتی نہیں؟“

مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ میری تحریریں بڑے شوق

کے پڑھتی اور پندرہ تھیں۔ ان دنوں میرا ایک مضمون "ساتی" میں شائع ہوا تھا  
غالباً "ترقی یافتہ قبرستان" معلوم نہیں اُس کا ذہن کیوں اس طرف چلا گیا۔ "خدا  
کی قسم نہ ٹو۔۔۔ بہت خوب لکھتے ہو۔ ناالمم کیا ٹھنڈکیا ہے اس مضمون میں۔۔۔ کیوں  
بے بی۔ اس دن کیا حال ہوا تھا میرا مضمون پڑھ کر۔"

مگر زگرس اپنی ناریدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطراب بھے  
لبھ میں اُس نے اپنی ماں سے کہا۔ "چلو بی بی۔"  
جَدَنْ باَنِي بَحَدْ سَمَّاَنْ خَاطِبْ بَهْوَيْ - "چلو بھائی۔"

گھر پاس ہی تھا۔ موڑ اٹارٹ ہوئی اور ہم ہنپھ گئے۔ اور بالکلی سے تینوں  
نے ہمیں دیکھا۔ چھوٹی دو کالے خوشی کے بڑا حال ہوا تھا۔ خدا معلوم آپس میں کیا  
کھسہ پھر کر رہی تھیں۔ جب ہم اور پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب کی ملاقا  
ہوئی۔ زگرس اپنی ہم عمر اڑکیوں کے ساتھ دوسرا کرے کرے میں پلی چھوٹی۔ اور میں  
میری بیوی اور جَدَنْ باَنِي دہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زادیوں سے کان پھولی کے سلسلے پر تبصرہ کیا گیا۔  
میری بیوی کی بوکھلا ہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اُس نے میریان کے فرانس سرجنامہ  
دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جَدَنْ باَنِي فلم انڈسٹری کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے  
پان کھانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پندیں اس ساتھ کھتی  
تھی بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر خوب ہاتھ صاف  
کیا۔

زگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ وہ گیارہ برس کی بھی تھی جب میں نے ایک دو بار فلوں کی نمائش غلطی میں اُسے اپنی ماں کی اٹھلی کے ساتھ پہنچا دیکھا تھا۔ چند ہی ماں ہوئی آنکھیں۔ بے کشش سالمبوڑہ چہرہ۔ سو کھی سو کھی مانجھیں دیا معلوم ہوتا تھا۔ سو کے اٹھی ہے یا سونے والی ہے۔ م McGrub وہ ایک جوان رٹکی تھی۔ عمر نے اُس کی خالی جھیں پر کر دی تھیں۔ م McGrub آنکھیں دیسی کی دیسی تھیں۔ چھوٹی اور خوابازدہ۔ بیمار بیمار۔ میں نے سوچا اس رعائت سے اُس کا نام زگس موزوں و مناسب ہے۔

بلیعت میں نہایت ہی معصوم کھلنڈ را پن تھا۔ بار بار اپنی ناک پوچھتی تھی ہیے از لی زکام کی شکار ہے رہرات میں اس کو ادا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس کے ادا اس ادا پھرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اپنے اندر کردار نگاری کا جوہ رکھتا ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر لفظ کر بات کرنے اور مسکلنے میں کو بظاہرا کیک بناوٹ لھتی۔ مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ انتیار کر کے رہے گی۔ آخر کردار نگاری کی بنیاد میں بناوٹ ہی پر تو استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی۔ وہ یہ ہے کہ زگس کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی اشارہ بننے والی ہے۔ م McGrub دن قریب تر لانے اور اُسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت نہیں تھی اس کے علاوہ اپنے رٹکپن کی نئی منی خوشیاں گھیٹ کر بڑی بڑی بے نیگم خوبیوں کے دائرے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر ٹکیاں دوسرا کرے میں جو باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا دارہ گھر اور کنوت کی چار دیواری تک محدود تھا۔ فلم اسٹلڈو میں کیا ہوتا ہے۔ رونس سکا بلا ہے اس سے اُسیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ زگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم شارب ہے پر دسے پر جس کی ادائیں بھی ہیں۔ اور اس کی سہیلیاں بھی یہ بھول گئیں تھیں کہ زگس اسکرین پر بڑی بڑی حرکتیں کرنے والی ایکٹریس ہے۔

میری بیوی بو عمر میں زگس سے بڑی تھی۔ اب اس کی آمد پر بالکل بدل گئی تھی۔ اُس کا سلوک اُس سے ایسا ہی تھا۔ جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اُس کو زگس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ فلم ایکٹریس ہے پر دسے پر بڑی خوبی سے نت نے مردوں سے مجت کرتی ہے۔ ہنستی ہے۔ آہیں بھرتی ہے۔ کہ کٹے لکاتی ہے ساب اُس سے خجال تھا کہ وہ کھٹی چیزیں نہ کھائے۔ بہت مختدا پانی نہ پئے۔ زیادہ فلموں میں کام نہ کرے۔ اپنی محنت کا خجال رکھے۔ اب اُس کے نزدیک زگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

ادھر ادھر کی پاؤں کے بعد زگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا نہ نائے اس پر جدن پائی نے کہا۔ دیں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی۔ موہن بابو اس کے خلاف تھے اور پسچ پڑھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ تھوڑا بہت ٹوں ٹاں کر لیتی ہے۔ ”اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔ ”سادو بے بی۔ جیسا بھی آتا ہے سادو۔“

زگس نے بڑی ہی معمودانہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا۔ پرے درجے کی کن صریح تھی۔ آداز میں رس نہ لوچ، میری چھوٹی سالی اُس سے

لائقوں درجے بہتر کا تھی۔ مگر فرمائش کی گئی تھی۔ اور وہ بڑی پر اصرار، اسرائیل  
دو تین منٹ تک اُس کا لگانا پرداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اُس نے ختم کیا تو سب  
نے تعریف کی۔ تھوڑی دیر کے بعد جدن پائی نے رخصت چاہی۔ رُٹکیاں  
زگس سے گلے ملیں۔ دوبار ملنے کے بعد دے دید ہوئے پکپکھر پھر بھی  
ہوتی اور ہمارے ہمایاں پلے گئے۔

زگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ رُٹکیاں ٹیلفون کرتی تھیں۔ اور  
زگس آجیلی موڑ میں چلی آتی۔ اس آمد و رفت میں اُس کے ایکریس ہونے کا  
احساس قریب قریب مت گیا۔ وہ رُٹکیوں سے اور رُٹکیاں اُس سے یوں  
ملتیں ہیں وہ ان کی بہت پرانی سہیلی ہے۔ یا کوئی رشتہ داری سے لیکن جب وہ  
چلی جاتی تو کچھی کچھی تینوں ہنیں استیحااب کا انہما رکھتیں۔ خدا کی قسم مجید بتا  
ہے کہ زگس بالکل ایک طس معلوم نہیں ہوتی۔

اس دوران میں تینوں ہنیوں نے اُس کا ایک تازہ فلم روکھا جس میٹا ہر  
ہے کہ وہ اپنے میرد کی محبوبہ تھی جس سے وہ پیار محبت کی پاتیں کرتی تھی۔ اور  
اُسے عجیب تکاہوں سے دیکھتی تھی۔ اُس کے ساتھ نگ کر کھڑی ہوتی تھی۔  
اس کا ہاتھ دباتی تھی۔ میری بیوی کہتی۔ وہ کم بخت اُس کے فراق میں کہی لمبی  
لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ ہیے پچ پچ اُس کے شقی میں گرفتار ہے۔ اور اس  
کی چھوٹی دو ہنیں اپنے گزارے ایکٹنگ سے نا آشنا دلوں میں سوچتیں ہاڑ  
کل وہ بھم سے پوچھر رہی تھی کہ گڑا کی ٹوفی کیسے بنتی ہے۔“

زگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطی

طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ بہت کی بعض کس طرح  
چلتی ہے۔ یہ انماڑی انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی ہیں۔ عشق کی دوڑ میں تھک کر  
ہانپنا اور اسکوں کی دوڑ میں تھک کر سانس پھول جانا و مختلف چیزیں ہیں میرا  
خیال ہے کہ خود زگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کے شروع  
شروع کے فلموں میں چنائی و قبیلہ رس نجما ہیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں کہ اس کی  
اداکاری یکسر فریب کاری سے متراحتی

تصنعت کا یہ کمال ہے کہ تضع معلوم نہ ہو۔ لیکن زگس کے تضع کی بنیادیں  
چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں۔ اس لئے اس میں یہ خوبی نہیں تھی۔ یہ صرف  
اس کا فلوس تھا۔ وہ ہے پناہ خلوص جو اُسے اپنے شوق سے تھا کہ وہ  
جذبات و احساسات کے نہایت ہی خام انہمار کے باوجود اپنا کام نجما جاتی  
تھی۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ اب وہ بہت بخشنده اختیار کر سکی ہے اب  
اس کو عشق کی دوڑ اور اسکوں کی ایک میں کی دوڑ میں تھک کر ہانپے کا فرق معلوم  
ہے۔ اب تو اس کو سانس کے بلکے سے بلکے زیر و بم کا نفیستی بیس منظر بھی  
معلوم ہے۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ اُس نے اداکاری کی منازل آہستہ آہستہ طے کیں  
اگر وہ ایک ہی جست میں آخری منزل پر پہنچ جاتی۔ تو اہل ذوق فلم میزوں کے  
ضد ایمانہ جذبات کو بہت ہی گنوار قسم کا صدمہ پہنچتا۔ اور اگر رٹکپن کے زمانہ  
میں پر دے سے الگ زندگی میں بھی وہ ایکر ڈس بنی رہتی۔ اور اپنی عمر کو  
یعنی بزرگوں کے گز سے ناپ کر دکھاتی۔ تو میں اس صدمہ کی تاب نہ لامس

یقیناً مر گیا ہوتا۔“

زگس ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی کہ اُس کو لا محالہ ایکرٹس بنا ہی تھا۔ جدن بائی کے گلے میں بڑھا پے کا گنگر دبول رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے مگر اُس کی ساری توجہ بے بی زگس پر مرکوز تھی۔ اُس کی شکل و صورت معمولی تھی۔ گلے میں سر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر جدن بائی باتی تھی کہ سُر متعار لیا جاسکتا ہے اور معمولی شکل و صورت میں اندر دفی رشتنی سے جسے جو ہر کہتے ہیں۔ دلکشی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے جان مارکر اس کی پروردش کی۔ اور کاپنے کے نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے ذرتے جوڑ جوڑ کر اپنا درختاں دتا باں خواب پورا کیا۔

جدن بائی تھی۔ اس کی ماں تھی۔ اس کا موہن بابو تھا۔ بے بی زگس تھی اس کے دو بھائی تھے۔ انہا بڑا کبھی تھا جس کا بوجھ صرف جدن بائی کے کندھوں پر تھا۔ موہن بابو ایک بڑے رہیں زادہ تھے۔ جدن بائی کے گلے کی تالوں اور مرکیوں میں ایسے اٹھجھے کہ دین دینیا کا ہوش نہ رہ۔ خوبصورت تھے۔ صاحب ثروت تھے۔ قلعہ یا فتح تھے۔ بحث مند تھے۔ مگر یہ سب دو تیس جدن بائی کے درپر گداگر بن گئیں۔ جدن بائی کا اس زمانہ میں دلمبا بنتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجہ اُس کے مجردی پر سونے اور چاندی کی بارش بر ساتے تھے۔ مگر جب بارشیں تھم جاتیں اور آسمان نکھر جاتا تو جدن بائی اپنے موہن کو ٹھکار کر سینے سے لگالیتی ہے۔ کہ اُسی موہن کے پاس اُس کا دل تھا۔

موہن بابو تا دم آخر جدن پائی کے ساتھ تھے۔ وہ اُن کی بہت عزت کرتی تھی۔ اس نے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی پوسنگوں پلکی تھی۔ اُس کو اپنی طرح معلوم تھا کہ اُن کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ موہن بابو سے محبت کرتی تھی۔ کہ وہ اُس کے پتوں کا باپ تھا۔

چالات کی رو میں جانے کدھر بہہ گئا۔ زگس کو ہر حال ایکٹرنس بنتا تھا چنانچہ وہ بن گئی۔ اس کے باام عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُس کا خلوص ہے جو قدم بد قدم، منزل بہ منزل اُس کے ساتھ رکھ لے ہے ایک بات جوان ملاقا توں میں خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ زگس کو اس بات کا احساس تھا کہ جن لڑکیوں سے وہ ملتی ہے۔ وہ مقدم کے آب و گل سے بُنی ہیں۔ وہ اُن کے پاس آتی تھی اور گھنٹوں ان سے معصوم مقصوم باتیں کرتی تھی۔ مگر وہ اُن کو اپنے گھر مل کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھگڑ محسوس کرتی تھی۔ اس کو شاید یہ در تھا کہ وہ اُس کی دعوت تھکر دیں گی۔ یہ کہیں کی کہ وہ اُس کے ہاں کیسے جا سکتی ہیں۔ میں ایک دن گھر پر موجود تھا کہ اُس نے سرسری طور پر اپنی ہمیلیوں سے کہا۔ ”اب کبھی تم بھی ہمارے گھر آؤ۔“

یہ سُن کر تینوں بہنوں نے بڑے بھائیڈے پن سے ایک دوسرے کی طرف رکھا۔ وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں۔ کہ ہم زگس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں۔ لیکن میری بیوی چونکہ میرے چالات سے واقف تھی۔ اس نے ایک روز زگس کے پہم اصرار پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی۔ اور مجھے بتائے

بیغیر تینوں اس کے گھر حلی گئیں۔

زگس نے اپنی کار زینج دی تھی۔ جب وہ بیٹے کے خوبصورت ترین مقام میرائیں ڈرائیور کے اس فلیٹ میں پہنچیں جہاں زگس رہتی تھی۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی آمد پر خاص انتظامات کئے گئے ہیں۔ موہن با بو اور اس کے دو نوجوان رُکوں کو منع سر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ زگس کی سہیلیا آرہی ہیں۔ مرد نو کروں کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں ان "معزز" ہمہ انوں کو بھایا گیا تھا۔ خود قہدن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر ان کے پاس بیٹھی اور اندر حلی گئی۔ وہ اُن کی معصوم گفتگوؤں میں مارچ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

تینوں بہنوں کا بیان ہے کہ زگس اُن کی آمد پر پھولی نہ سماٹی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھی کہ بار بار گھر اسی جاتی تھی۔ اپنی بہنیوں کی خاطرداری میں اُس نے بڑے بوش کا انہار کیا۔ یا اس ہی پیر ٹرین ڈری می تھی۔ اس کے دلک شیک مہشور تھے۔ کارڈی میں جا کر زگس خود رہ مشروب جگ میں تیار کرائے لانی۔ کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ پھر اس کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطرداری کے اس بوش و خروش میں زگس نے اپنے نئے سینٹ کا گلاس توڑ دیا۔ ہمہ انوں نے افسوس کا انہار کیا۔ تو زگس نے کہا۔ بد کوئی بات نہیں بی بل غصہ ہوں گی۔ مسخر ڈریڈی اُن کو چُپ کر ادیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

موہن بابو کو اُس سے اور اُس کو موہن بابو سے بہت محبت تھی  
ولیک ٹیک "پلانے کے بعد زگس نے ہمانوں کو اپنا الجم دکھایا جس میں  
اُس کی مختلف فلموں کے امثلے تھے۔ اُس زگس میں جوان کو یہ فونڈ گھاری تھی اور  
اُس زگس میں جوان تصویر دیں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بہنیں کبھی اُس  
کی طرف رجھتیں اور کبھی الجم کے اور راق کی طرف اور اپنی چہرتے کا بولن لہا  
کر تیں۔ بعد زگس، تم یہ زگس کیسے بن جاتی ہو۔"  
زگس جواب میں صرف مُسکرا دی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں زگس کی ہر حرکت، ہر ادای میں لہڑہ  
پن تھا۔ اُس میں وہ شوختی، وہ طاری، وہ سیکھا پن ہنسیں تھا جو اُس کے سراپا  
میں پردے پر نظر آتا ہے۔ وہ پڑیا ہی گھر میں قسم کی رہی تھی۔ میں نے خود بیوی  
محوس کیا تھا لیکن جانے کیوں اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و  
غیر قائم کی ادا کی تیرتی نظر آتی تھی، جیسے کوئی لاوارث لاش، تالاب کے  
ٹھہرے پانی پر ہوا کے بلکے جھونکوں سے ارتقاش پذیر ہے۔  
یقظی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر زگس کو پہنچا تھا وہ کچھ  
زیادہ دور نہیں۔ تقدیر اپنا فیصلہ اُس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات  
اُس کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی۔ کیا غیر شوری طور پر  
وہ یہ محسوس تو نہیں کر رہی تھی کہ عشق و محبت کا یہ مسنونی کھیل کھیلتے کمیلتے تک  
وہ دہ کسی ایسے لق و دلق صحرا میں نکل جائے گی جہاں سراپا ہی سرب  
ہوں گے۔ پیاس سے اُس کا حل سوکھ رہا ہو گا۔ اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی

بدلبوں کے ہننوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اُترے گا کہ وہ خجال  
کریں گی کہ زگس کی پیاس مخف بناوٹ ہے۔ زمین کی کو کھیں پانی کی بوندی  
اور زیادہ اندر کو سمجھ جائیں گی۔ اس خجال سے کہ اُس کی پیاس صرف ایک دکھا  
ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود زگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس ہمیں  
جھوٹ پیاس تو نہیں۔

امتنے برس گذر جانے پر میں اب اُسے پر دہ پر دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اُس  
کی اُداسی کچھ مفصل سی نظر آتی ہے۔ پہلے اُس میں ایک مستعد جنجوٹی ہیں لیکن اب  
مبتو بھی اُداس اور مفصل ہے۔ کیوں۔ اس کا جواب خود زگس نے  
سلکت ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ چوری چوری زگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ  
زیادہ دیر تک اُس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندریثہ تھا کہ ایسا نہ ہو  
مجھے اُس کا حلم ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے زگس سے رخصت چاہی۔ اور  
داپس لکھ رکھ گئیں۔

زگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں گھوم پھر کر اُس کے شادی  
کے مسئلہ پر آ جاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ چاندنے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور  
کہاں شادی کر لی۔ بڑی جس کی شادی ہوئے پانچ برس ہو پکے تھے۔ یہ  
سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ماں کیسے بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بیوی نے زگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے  
رکھا۔ آخر ایک روز تباریا میں نے مصنوعی خلفی کا اظہار کیا۔ تو اُس نے

پر سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔ ”واقعی ہم سے غلطی ہوئی مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔“

وہ پاہتی تھی کہ بات بھی تکرار ہے۔ ایک ایجنس کے گھر جاتا ہیں وہ بہنوں کے نزدیک بہت ہی میوب بات تھی۔ وہ اس حرکت کو چھپانا پاہتی تھیں۔ چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہوا اس کا ذکر انہوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ باہل تنگ خال نہیں تھیں۔

میں اب تک نہ سمجھ سکا کہ اُن کی وہ حرکت حرکتِ مذوم کیوں تھی، اگر وہ زگس کے ہاں گئی تھیں۔ تو اس میں بُرانی ہی کیا تھی؟ اداکاری میوب کیوں بھی جاتی ہے؟ کیا ہمارے فائدے کے طبقے میں اسیکے افراد نہیں ہوتے جن کی ساری عمر فریب کاریوں اور ملمع کاریوں میں گذر جاتی ہے۔ زگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا۔ اُس نے اس کو راز بنایا کہ اس کا رکھا تھا۔ لکھا۔ بڑا فریب جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔



# پھر میاں کی بیٹی

پرہ پچھرہ نسیم

میرا فلم دیکھنے کا شوق امر تسلیم میں ختم ہو چکا تھا۔ اس قدر فلم دیکھنے تھے کہ اب اُن میں میرے لئے کوئی کشش بیان رہی تھی۔ چنانچہ ہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ دار "تصور" کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بھی پہنچا تو میںوں کسی سینما کا خرخ نہ کیا۔ پرچہ فلم کا پاس مل سکتا تھا۔ مگر طبیعت اور ہر راغب ہی نہ تھی۔

اُن دنوں۔ ۱۹۷۰ء میں ایک ایکٹرنس نیم بازو فاص مشہور تھی اس کی خوبصورتی کا بہت چرچا تھا۔ اشتہار دل میں اس سے پرہی پچھرہ نیم کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہی اخبار میں اُس کے کتنی فوٹو دیکھے۔ خوش شکل تھی۔ جوان تھی۔ فاص طور پر آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ اور جب آنکھیں پر کشش ہوں تو سارا پچھرہ پر کشش بن جاتا ہے۔ نیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے۔ جو سہرا ب مودی نے بنلئے تھے

اور عوام میں کافی مقبول ہوئے تھے۔ یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا۔ معلوم نہیں کیوں ؟ عرصہ گزر گیا۔ اب مزدامودی ٹون کی طرف سے اُس کے شاندار تاریخی فلم "پکار" کا اشتہار بڑے زوروں پر ہوا تھا۔ پری چہرہ نیم اس میں نور جہاں کے روپ میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہرا بہادر مودی خود اس میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

فلم کی پیاری میں کافی وقت صرف ہوا اس دوران میں انجاروں اور رسالوں میں جو "اٹل" شائع ہوئے وہ بڑے شاندار تھے۔ نیم نور جہاں کے باس فاخرہ میں بڑی پر وقار دکھائی دیتی تھی۔

"پکار" کی نمائش عظیمی پر میں مدعا تھا۔ جہان یگر کے عدل و انصاف کا ایک من گھرت قصہ تھا جو بڑے جذباتی اور تھیسٹری امداز میں پیش کیا گیا ہے فلم میں دو باتوں پر بہت زور تھا مکالموں اور ملبوسات پر۔ مکالمے کو غیر فطری اور تھیسٹری تھے۔ لیکن بہت زور دار اور پرشکوہ تھے جو سننے والوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ پوچھ کر ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنایا تھا۔ اس لئے نیم سہرا بہادر کا "پکار" سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندستی صنعت فلم سازی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اُس کی کمزوری کو اُس کے خداداد حسن اور نور جہاں کے باس نے جو اُس پر خوب سمجھا تھا۔ اپنے اندر پھپا لیا تھا۔

اس دوران میں نیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں فلمی

دنیا میں اسکینڈلِ عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سئنسے میں آتا تھا کہ سہرا ب مودی نیم بانو سے شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوتی ہے۔ کہ نظام حیدر آباد کے صاحبزادے معلم جاہ صاحب نیم بانو پر ڈورے ڈال رہے ہیں۔ اور غیرتیب اُسے لے لائیں گے۔ یہ خبر درست ہے۔ کیونکہ شہزادہ کا تمام اُن دنوں اکثر بھائی میں ہوتا تھا۔ اور وہ بھائی بار نیم کے مکان دائیٰ میراں ڈرائیور پر دیکھے گئے تھے۔

شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کئے۔ بعد میں حسن کا حساب دینے کے سلسلے میں انہیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ آپ روپے کے زدرے سے نیم کی والدہ عرف چھپیاں کو رفما دکرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ پری چھرہ نیم کا اتفاقات خرید کر آپ اُسے اس کی والدہ سمیت حیدر آباد لے گئے۔

تحوڑے ہی عرصہ کے بعد جہاں دیدہ چھپیاں نے یہ محسوس کیا کہ حیدر آباد کی تید خانہ ہے جس میں اُس کی بچپن کا دم گھٹ رہا ہے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے۔ بحروفنا میں لکھنے سے تھی۔ پھر کیا پتہ تھا کہ شہزادے کی لا ابادی طبیعت میں ایکا ایکی انقلاب آ جاتا اور نیم بانو ادھر کی رہتی نہ ادھر کی۔ چنانچہ چھپیاں نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ حیدر آباد سے نکلا بہت مشکل تھا مگر وہ اپنی بچپنی نیم کے ساتھ واپس بھائی آنے میں کامیاب ہو گئی۔

میں اب قلی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر غشی ہی کی جیت سے اپر میں فلم لکپنی میں کام کیا۔ یعنی ڈائرکٹر د کے حکم کے مطابق اُٹھی سیدھی

زبان میں فلموں کے مکالے لکھتا رہا۔

اس دوران میں ایک اعلان نظریوں سے گذر اکہ کوئی صاحبِ حکایت  
ہیں۔ انہوں نے ایک فلم کمپنی تاج محل کچرہ کے نام سے قائم کی ہے۔ پہلا فلم  
”اجالا“ ہو گا جس کی ہیر و من پر ہی چہرہ نیسم بانو ہے۔

اس فلم کے بنانے والوں میں د مشہور ہستیاں تھیں۔ ”پکار“ کا مصنف  
کمال امرد ہی اور پکار ہی کا پلٹی نیجر۔ ایم۔ اے۔ بی۔ فلم کی تیاری کے  
دوران میں کئی جگڑے کھڑے ہوئے۔ امیر جدر کمال امرد ہی اور ایم۔  
اے۔ بی۔ کی کئی بار آپس میں پنج ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک  
بھی پہنچے۔ مجرد ”اجالا“ انجام نہ کا ممکن ہو گیا۔

کہانی معمولی تھی۔ موسیقی کمزور تھی۔ ڈائرکشن میں کوئی دم بیس تھا۔ چنانچہ  
یہ فلم کامیاب نہ ہوا اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا  
کہ ان کو اپنا کار و بار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کار و بار میں وہ اپنا دل نیسم بانو کو دے بیٹھے احسان صاحب  
کے لئے نیسم ابھی بیسیں تھیں۔ ان کے والد خان۔ بہادر محمد سلیمان چیف انجینئر نیسم کی  
والدہ عرف چھپیاں کے پرستار تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک لیاظ سے وہ ان کی  
دوسری بیوی تھی۔ احسان صاحب کو یعنی نیسم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو گا فلم  
کی تیاری کے دوران میں تو خیر و نیسم کے بالکل قریب رہے تھے لیکن لوگوں  
کا بیان ہے کہ احسان اپنی جھینپو اور شریملی طبیعت کے باعث نیسم سے پوری  
طرح کھل نہیں سکے تھے۔ بیٹ پر آتے تو خاموش ایک گونے میں بیٹھ رہتے

نیسم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہو آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے،  
یکونکہ ایک دن ہم نے ناکہ پر تپھرہ نیسم نے مٹرا حسان سے دلی میں شادی  
کر لی ہے۔ اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اب فلموں میں کام نہیں کرے گی۔

نیسم بانو کے پرستاروں کے لئے یہ خبر ڈی افسوناک تھی۔ اس کے  
حُسن کا جلوہ کیونکہ صرف ایک آدمی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ احسان اور نیسم  
کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیے ہنپھ۔ مجھے اس کا علم  
نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اشوك کمار کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ اشوك کمار  
ایک صاحب کیسٹن صدیقی کا دوست تھا۔ یہ مٹرا حسان کے قریبی عزیز تھے ”جالا“  
میں انہوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

ایک دن جب اشوك، صدیقی صاحب کے گھر گیا تو وہ موجود نہیں تھے۔  
لیکن وہ خوبصورت تھی۔ بڑی لطیف۔ لیکن بڑی شریر۔ اشوك نے سونکھے سونکھے  
کرنے کے ذریعے سے معلوم کر لیا کہ یہ اور پرکی منزل سے آرہی ہے۔ سیرھاں  
ٹے کر کے وہ اور پرہنچا۔ کمرے کے کوارٹ خوارے سے کھلتے تھے۔ اشوك نے  
چانگ کر دیکھا۔ نیسم بانو پانگ پر لٹی تھی۔ اور اس کے پہلو میں ایک صاحب  
بیٹھے اس سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ اشوك نے بھاپ بیا مٹرا حسان  
تھے۔ جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوك نے جب کیسٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی۔ تو  
وہ مکارے۔ یہ سلسلہ کافی دیر سے جاری ہے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ اخباروں میں ہنسگامہ رہا۔ مسخر چھپنیں

فلی حلقوں سے او جمل ہو گئی تھی۔

اس دوران میں فلمی دنیا میں بھی انقلاب آئے۔ نئی فلم کپیاں نہیں۔ کئی ڈسٹرکٹس میں طوائف الملوك بھیلی ہوئی تھیں (دیوکارانی (مسن) ہمان سورائے اور رائے پہا در پونی لال (جزل بیخ) میں بات بات پر طبقی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رائے پہا در اپنے گروپ کے ساتھ بھی ڈاکٹر سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پر ڈیو سرا ایس مکرجی۔ انسان نگار اور ڈارکٹر گیان مکرجی مشہور صیرداد شوک سکار۔ کوئی پر دبپ۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ۔ ایس و اچا۔ کامیڈین وی ایچ ڈیسائی۔ مکالمہ نگار شاہد لطیف اور سنتو شی شامل تھے۔

بھی ڈاکٹر سے نکلتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کمپنی "فلستان" کے نام سے فلم کی۔ پر ڈکشن کرنٹ اور ایس مکرجی مقرر ہوئے جو سلوچ جو بلی فلم بنائیں بہت شہرت حاصل کر لیئے تھے۔ کہاںی دہانی بھی کئی۔ اسٹیڈیو نے ساز و سامان سے آگاہ رہ گیا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ مگر پر ڈیو سرا ایس مکرجی سخت پریشان تھے بھیے ڈاکٹر سے علیحدہ ہو کر وہ ڈیو سرا ایس کو خارج نہیں کئے۔ کئے کوئی شنسنی پھیلانے والی بات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ بات ہیر و ٹن کے اتنی بے کوئی تعلق تھی۔

بیٹھے بیٹھے ایک دن ایس مکرجی کو یہ سوچی کہ نیس باموکو و اپس کیفیت کر لایا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُسے اپنے اور پر پورا اعتماد تھا۔ پے در پے کئی کامرانیوں کے بعد اُس کو محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے

گاپور اکر لے گا۔

چنانچہ فوراً ہی نیم بازو تک پہنچنے کے راستے سوچ لئے گئے۔

اشوک کی وجہ سے ایس م McGrath کے بھی کہیں صدقی سے بڑے اپنے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ رائے بہادر چونی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سلیمان سے بے تکلف مراحم تھے۔ چنانچہ دل میں نیم تک رسائی مل کرنے میں ایس McGrath کو کسی شکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا مرحلہ پہلے احسان کو اور چھر نیم کو رضا مند کرنا تھا۔

McGrath کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دیا اور آخر کار رضا مند ہو گیا۔ فتح مدد ہو کر جب دہ واپس بھی آیا تو اخبار دی میں یہ بخبر بڑے ٹھاٹھ سے شائع کرائی۔ کہ فلستان کے پہلے فلم "عیل چل رہے نوجوان" کی ہیر و فن پر ہی چھر نیم بازو ہو گی۔ فلمی ملتوں میں سننی چیل گھنی بیونکہ نیم فلمی دنیا سے بیشہ کے لئے علیحدگی افیکٹ کر چکی تھی۔

چند روز کے بعد "ماد" سے شاہزادی طیف کا ذون آیا کہ پردیو سر ایس McGrath مجھ سے انٹرو یو کرنا پا ہتے ہیں۔ یہونکہ سینیر یو ڈیپرٹمنٹ کے لئے لیکن ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

لمازت کی بجھے کوئی خواہش نہیں تھی۔ صرف استھن یو دیکھنے کے لئے میں فلستان چلا گیا۔ فضابری اچھی تھی۔ بیسے کی یونیورسٹی کی۔ اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ McGrath سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بیحد پسند آئے۔ چنانچہ وہیں کٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔ تھنواہ بہت تھوڑی تھی۔ بھل تین سور و پے ماہوار

اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ ایک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب لگتا تھا۔ ”گوئے گاؤں“ پہنچنے میں۔ لیکن میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ تխواہ مخوری ہے۔ لیکن میں ادھر ادھر سے کمایا کر دیں گا۔

شروع شروع میں تو فلستان میں میری مالت ابھی کی سی تھی۔ لیکن یہ جلد میں تمام اشان کے ساتھ گھنڈ مل گیا۔ ایسی مکری سے تو میرے تعلقات دوستانہ چاک پنج گئے تھے۔

اس دوران میں نیم بازو کی چند جملکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ نیزروی لکھا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ چند لمحات کے لئے موڑ میں آتی اور دوپس چلی جاتی۔

ایسی مکری بڑا مشکل پسند واقع ہوا ہے۔ ہمیں وہ کہانی کی توک پکیست کرنے میں لگ گئے۔ خدا خدا کے فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ مگر یہ وہ سیں تھے۔ جن میں نیم بازو نہیں تھی۔ بالآخر اُس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اس ندوی کے باہر فولڈنگ کری پر بیٹھی تھی۔ ٹانگ پڑانگ رکھے ہتموس سے چاہرپی رہی تھی۔ اشوک نے میرا اُس سے تعارف کرایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئی اور بڑی باریک آواز میں کہا۔ ”میں نے ان کے مظاہن اور افسانے پڑھتے ہیں۔“

صودی دیر رسمی گفتگو ہوئی۔ اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ چونکہ وہ میک آپ میں تھی۔ اس لئے میں اُس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بولتے وقت اُسے کوششی

سی کرنی پڑتی تھی۔ یوں کہئے کہ جب وہ بولتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تکھوڑی سی مشقت کر رہی ہے

”پکار“ کی نیسم میں اور ”چل چل رے نوجوان“ کی نیسم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُدھر وہ ملکہ نورِ جہاں کے باس فاخرہ میں ملبوس اور اُدھر جہاں سیوا دل کی ایک رضاکار کی دردی میں یعنی چادر تپہ میک آپ کے بغیر دیکھا۔ تو میں نے سوچا۔ آرٹشِ محفل کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی وہ جگہ یا کونہ جہاں کم کھڑی ہوئی ایک دم سچ جاتا۔

لباس کے اختیاب میں وہ بہت محتاط ہے۔ اور زنگ پہنچنے کے معلمانے میں جو سلیقہ میں نے اس کے ہماں دیکھا اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد زنگ بڑا خدا ناک ہے۔ یکیوں نکہ زرد زنگ کے پڑے آدمی کو اکثر زرد مریض بنادیتے ہیں۔ مگر نیسم کچھ اس پلے پردا بنتے تکلفی سے پہ زنگ استعمال کرتی تھی کہ مجھے جھرت ہوئی تھی۔

نیسم کا محبوب لباس سارٹھی ہے۔ عزارہ بھی پہنچتی ہے میگر لگا ہے گا ہے شلوار قمیص پہنچتی ہے میگر صرف گھر میں۔ وہ پڑے پہنچتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے پاس رسول کے پڑے پڑے بڑی اچھی حالت میں موجود ہیں۔

نیسم کو میں نے بہت محنتی پایا۔ بڑی نازک کسی عورت ہے۔ ملکیٹ پر برابر دُلی رہتی تھی۔ ملکر جی کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں۔ کئی کئی ریپرسلیں سزا پڑتی تھیں۔ گھنٹوں جھلسادینے والی رشنا کے سامنے اٹھک بیٹھک کرنا پڑتی تھی

لیکن میں نے دریکھا کہ نیسم اکتائی نہیں تھی۔ نبھے بعد میں معلوم ہوا کہ اُس کو اداکاری کا بہت شوق ہے۔ ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ رشزد کیتے لختے۔ نیسم بازو کا کام سب گوارا تھا۔ اس میں چک نہیں تھی۔ وہ سمجھ دہ ادا یعنی جیسا کر سکتی ہے اپنے مغلی خداو خال کی جملکیاں پیش کر سکتی ہے۔ لیکن ناقدانہ بھاگوں کے لئے اداکاری کا جو ہر پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر ہمی "پل چل رے نوجوان" میں اس کا ایکٹنگ پہلے فلموں کے مقابلہ میں کچھ بہتری تھا۔

مگر جی اس میں کڑخنگی اور دردستگی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ کیسے پیدا ہوتی۔ نیسم بے حد سرد مزاج ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ "پل چل رے نوجوان" میں نیسم کا یہ بیکرڈ ٹکڑہ ہو کے رہ گیا۔

فلم روپیز ہوارات کو تماج میں ایک شاندار پیاری دی گئی فلم میں نیسم بھی بھی ٹھیک ہے مگر وہ تماج میں سب سے الگ نظر آتی تھی۔ پرقدار باعثت مغلیہ شہزادیوں کی سی شان اور انفرادیت لئے۔

"پل چل رے نوجوان" کی تیاری میں دو برس لگ گئے تھے جب فلم توقعات کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا۔ تو ہم سب پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مگر جی تو بہت بیدل ہوا۔ مگر کنٹریجٹ کے مطابق چونکہ اُس سے تماج محل پھر ز کے ایک فلم کی نگرانی کرنا تھی اس لئے کمر بستہ ہو کر کام شروع کرنا پڑا۔

فلم "پل چل رے نوجوان" کی تیاری کے دران میں احسان اور مکر جی کے تعلقات بہت بڑھ کئے تھے۔ جب تماج محل پھر ز کے

فلکم کا سوال آیا۔ تو احсан نے اُس کا سارا ابو جہہ مکر جی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مکر جی نے بجھے سے مشورہ کیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ ”بیگم“ کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں جس میں اسیم کی خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

”بیگم“ لکھنے کے دوران میں مجھے نیسم بازو کو بہت قریب سے دیکھنے کے موقع ملے۔ میں اور مکر جی دوپہر کا کھانا اُن کے گھر پر کھاتے تھے۔ اور ہر روز رات کو دیر تک کہانی میں ترمیم و تنقیح کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خال تھا۔ نیسم بڑے عالیشان مکان میں رہتی ہے۔ مگر جب گھوڑ بندر رو ڈپر اُس کے بنگلے میں داخل ہوا۔ تو میری چرت کی کوئی انتہا نہ رہی بنگلہ نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ بڑا عمولی قسم کا فریضخ، جو غالباً اگر اے پہ لایا گیا تھا۔ گھا ہوا قالین، دیواریں اور فرش میں زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نیسم بازو کو دیکھا۔ بنگلے کے براہمیے میں دھگوائی سے دودھ کے کنپوں کے متعلق بات چیخت کر رہی تھی۔ اس کی دبی دبی آواز، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شش کے ساتھ ملن سئے تکالی جا رہی ہے۔ گوائے سے قبول ارہی تھی کہ اُس نے آدھ سیر دودھ کا ہمیسر بھیڑ کیا ہے۔ آدھ سیر دودھ پری چہرہ نیسم بازو جس کے لئے کئی فرما دد ددھ کی نہریں نکالنے کے لئے تیار تھے۔ میں چکر اگیا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ”پکار“ کی نوجہاں بڑی گھر میو قسم کی عورت

ہے۔ اور اُس میں وہ تمام قسم کی خصوصیات موجود ہیں جو ایک ناپتدار جہ گھر بیویوں کی ہوتی ہیں۔ اُس کی پچھرے "بیجم" کی پر وادکش شروع ہوئی۔ تو بلوسات کا سارا کام اُس نے سنبھال لیا۔ امدازہ تھا کہ دس پارہ ہزار اس میں پڑا۔ مگر نیسم نے درزی گھر میں بٹھا کر اپنی پرانی ساڑھیوں قیضوں اور غاروں سے تمام بیاس تیار کر دالئے۔

نیسم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں۔ کہ وہ بیاس پہنچتی ہے اس تھانے پہنچتی ہے۔ اُس پر ہر بیاس سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "بیجم" میں ایسی مکر جی نے اُس کو کثیر سے درہات کی ایک الھڑاڑ کی کے روپ میں پیش کیا۔ اُس کو قلوبڑہ بنایا۔ ہیر کا لمبا کرتہ اور لاچا پہنایا۔ موڑن بیاس میں بھی پیش کیا۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پر مکر جی نے ہم سب دیر تک (بعض اوقات رات کے تین تین بجے تک) بھیٹے کام کرتے رہتے ہیں اور مکر جی کہانی کی نوک پک درست کرتے رہتے اور نیسم اور احسان جان گئنے کی کوشش سرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ ملتی رہتی۔ وہ پری اور مکر جی کی باتیں سُنٹتے رہتے۔ لیکن جو ہنسی ان کی ٹانگ ملنا بند ہو جاتی۔ ہم سب سمجھ جاتے کہ وہ گہری نیند ہو گئے ہیں۔

نیسم بڑی اس سے بڑی جسم جلاہت ہوتی تھی کہ اُس کا شوہر نیند کا ایسا ناتا۔ دکھانی کے نہایت ہی دشوار گذار موڑ پر لمبی تانگ کر سو جاتا ہے۔ میں اور مکر جی احسان کو چھیرتے تھے تو نیسم بہت جز بزر ہوتی تھی۔ وہ اُن کو اپنی

طرف سے جھنجور کر جگاتی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ری دیکھ انھیں اور گھر  
نیند سُلاری ہے۔ جب نیم کی آنکھیں بھی مند نے لختی تو مکر جی رخت چلتے  
ادر پڑے جاتے۔

میرا گھر گھوڑ بند روڈ سے بہت دور تھا۔ بر قریب قریب پون  
گھنٹے میں مجھے دہان پہنچاتی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد گھر پہنچا۔ ایک  
اچھا خاص اعذاب تھا میں نے جب اس کا ذکر مکر جی سے کیا تو یہ طے ہوا کہ میں  
پکھ عرصہ کے لئے نیسم ہی کے پہاں اٹھ جاؤں۔

احسان بے حد جھینپو ہیں۔ کوئی بات کہنا ہو تو پرسوں لگادیتے ہیں انھیں  
میری آسائش کا چیال تھا۔ وہ چاہتے تھے جس چیز کی مجھے ضرورت ہو۔ میں  
آن سے بلا تکلف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی کہ وہ حرف مذعا زبان  
پر لاہی نہیں پاتے تھے۔ آخر کار ایک روز آن کے اصرار پر نیم نے مجھ سے کہا  
”تھانوں جس چیز دی ضرورت ہو وے دس دیا کرو۔“

نیم فٹ لاس پنجابی بولتی تھی۔ چل چل رے نوجوان“ کے زمانے  
میں جب میں نے رفیق غزوی سے جو اس پچھر میں ایک اہم روں ادا کر رہا تھا  
ذکر کیا۔ کہ نیم پنجابی بولتی ہے۔ تو اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا  
کہ تم بکتے ہوئی نے اُس کو یعنی دلانے کی کوشش کی مگر درہ نہ مانا۔

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نیم اور رفیق دونوں موجود  
تھے۔ اور اشوك انگریزی کے ”رہان مرود“ قفرے نیم سے کہلوانے کی  
کوشش کر رہا تھا۔ تو میں نے رفیق سے بچا۔ ”لائے! ادھر ٹو بجا کے

کہتے ہیں۔ ”

رفیق نے جواب دیا۔ ”یہ کس زبان کا لفظ ہے“  
میں نے کہا۔ ”پنجابی زبان کا، — بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟“  
رفین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”میزوں معلوم نہیں۔ اور ادھر دنبے  
دے پڑا۔“

نیسم نے گردن میں ہلکا ساختمانے کر رفیق کی طرف دیکھا اور سکر اس  
پنجابی میں اس سے پوچھا۔ ”چھی تھانوں ملوم نہیں۔“  
رفیق نے جب نیسم کے مخاطب سے پنجابی سنی۔ تو بقول شخے وہ اپنی پشتہ  
بھول گیا۔ لکھت بھرے ہجھی میں اس نے نیسم سے اردو میں کہا۔ ”آپ  
پنجابی جانتی ہیں۔“

نیسم نے اسی طرح سکر اکر کہا۔ ”جی ہاں۔“  
میں نیسم سے مخاطب ہوا۔ ”تو آپ بتائیے اور ادھر دنبے کا مطلب کیا ہے؟“  
نیسم نے کچھ دیر سوچا۔ ”وہ — پیاس جو مگر می استعمال کیا جاتا ہے۔“  
رفیق غزنوی اپنی پشتہ اور زیادہ بھول گیا۔

نیسم کے اردو کرد جو ایک خبر و کن ہال تھا۔ آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ مجھے  
ان کے بیٹھنے سے فلحانے میں پہلی بار نہانے کا آتفاق ہوا۔ تو مجھے بڑی نمائیدی  
ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے آرائستہ ہو گا۔ متقدم  
کے نہانے والے نک ہوں گے۔ نایاب صابن ہو گا۔ ٹب ہو گا اور تمام  
اوٹ پلانگ حیزبی ہوں گی۔ جو حسین عورتیں اور ایکٹریں اپنے حسن

کی افزائش کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ مگر دنہاں صرف ایک جست کی بالی تھی۔ نو نیسم کا ایک ڈونگا اور ملادٹے کے کنوں کا کھاری پانی کہ صابن نگھتے رہو اور بھاگ پیدا نہ ہو۔

لیکن نیسم کو جب بھی دیکھو تو تمازہ اور نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ میکٹ پ کرتی تھی مگر ہمکا ہلکا۔ شوخ رنگوں سے اُسے نفرت ہے۔ وہ صرف دیہی رنگ استعمال کرتی ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی معتدل۔

عطریات سے اُس کو عشق ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبویات اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سینٹ تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ زیور ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے مگر ان میں لدی پہنچنی نہیں ہوتی۔ کبھی ہیرے کا ایک کنگن پہن لیا۔ کبھی جڑا اور چوڑیاں اور کبھی موتویوں کا ہار۔

ان کا دسترخان میں نے کبھی پُر تخلف نہیں دیکھا۔ احسان کو دے کی شکایت رہتی ہے اور نیسم کو زکام کی۔ دونوں پر ہمیزی کو شش کی کرتے تھے۔ نیسم میری ہری مرپیں لے آڑتی تھی اور احسان نیسم کی پلیٹ پر لاملا صاف کر دیتے تھے دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب پچکانہ قسم کی پیخ ہوتی تھی۔ دونوں کی نگاہیں جب اس دوران میں ایک دوسرے سے ڈکڑاں تو دیکھنے والوں کو صاف پہ لگ جاتا ہے۔ کہ وہ محبت آشنا ہیں۔

بنطا ہر سڑا حسان بہت دبیل قسم کے انسان ہیں۔ مگر انہی بیوی کے معاملے میں بہت سخت گیر داقع ہوتے ہیں۔ نیسم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ عام ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے نیسم کو بات چیت کی ٹافت

ہے۔ دیسے نیم بھی پھیپھوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شور و غل برپا کرنے والی پاریوں سے وہ خود بھی دور رہتی ہے لیکن ایک وفاہ اُسے ایک بہت بڑے بنتگائے میں حصہ لینا پڑتا۔

یہ ہنگامہ ہوئی کا۔ ہنگامہ تھا۔ جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک ”ٹریننگ“ برکھا کے آغاز پر ”ڈپارٹمنٹ“ ہے۔ اسی طرح بے ٹایز کی ایک ٹریننگ ہوئی کی رنگ پارٹی تھی۔ چونکہ فلتان کے تقریباً تمام کارکن بے ٹایز کے ہوا جرتئے اس لئے یہ ٹریننگ یہاں بھی قائم رہی۔

ایسے مکر جی اس رنگ پارٹی کے رنگ لیدتھے۔ عورتوں کی کمانات کی موٹی اور منس بکھپوئی راشوک کی ہیں) کے پردھنی۔ میں شاہد لطیف کے ہاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی عصمت (چھترائی)، اور میری بیوی (صیفہ)، دو نو خدا معلوم کیا پاتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم شور برپا ہوا۔ عصمت چلائی۔ ”لو صیفہ دہ آگئے۔۔۔ لیکن میں بھی ۔۔۔۔۔۔“

عصمت اس بات پر اگئی۔ کہ وہ کسی کو اپنے اوپر رنگ پھینکنے نہیں دے گی لیکن وہ چند لمحات ہی میں زنگوں میں لٹ پٹھکنی بن کر دوسرا بھنوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی دہی تھا۔ جو ہوئی کے دربارے بھنوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے تو شاہد لطیف نے بآذان لند کہا۔ ”پلوپری چہرہ نیم سے گھر کا رخ کرو۔“

زنگوں سے مسلح گردہ گھوڑ بندوں کی اونچی نیچی تارکوں لگی سطح پر بے

ڈھنگے بیل بوئے بنا آما۔ اور شور مچاتا نیم کے بیکلے کی طرف روانہ ہوا پھر منٹوں میں ہی ہم سب وہاں تھے۔ شور من آنیم اور احسان پاہنچلے نیم بلکہ نگ کی جا رجھ کی سارہ صی میں بوس میک آپ کی نوک پلک نکالے جب جوم کے سلنے برآمدے ہیں میں نمودار ہوئی تو شاہد نے بزن کا حکم دیا۔ مگر میں نے اُسے روکا۔ بدھرو پہلے ان سے کہو کپڑے بدل آئیں۔“

نیم سے کپڑے بدلنے کو کہا گیا۔ تو وہ ایک ادا کے ساتھ سکران۔

”یہی ٹھیک ہیں۔“

ابھی یہ الفاظ اس کے مندرجہ میں تھے۔ کہ ہولی کی پچکاریاں برس پڑیں چند لمحات ہی میں پری چہرہ نیم بازو ایک عجیب و غریب قسم کی خونناک چڑیل میں تبدیل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تہہ میں سے جب اُس کے سفید اور پیکلے دانت اور پڑی بڑی آنکھیں نظر آتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہزاد اور فانی کی مصوری پر کسی بچے نے یا ہی انڈیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہونے پر کبڑی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا پسخ شروع ہوا۔ پھر خورتوں کا۔ یہ بہت دلچسپ تھا۔ مسٹر میر جی کی فربہ یہوی جب بھی گرتی ہتھوں کا طوفان برپا ہو جاتا۔ میری یہوی عینک پوش تھی۔ شیشے رنگ آؤ دہونے کے باعث اسے بہت کم نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر غلط سنت دوڑتے تھی۔ نیم سے بھاگا نہیں جاتا تھا یادہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ کہ وہ اس مشقت کی عادی نہیں۔ بہر حال وہ برابر کھیل میں حصہ لیتی رہی نیم اور اُس کے میان بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس

قہم کے مذہبی آدمیوں سے ہے جو اُردو کے انجار دوں کے پڑھنے سے زمین  
سے اٹھا کر چوتے ہیں اور سر انگھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ رکھتے  
ہیں تو اور دُودھ کرنے کے لئے سارا آسمان کھنگانا شروع کر دیتے ہیں۔ دو نو  
تو ہم پرستہ ہیں۔ خاص طور پر میاں احسان — رس کو رس پر اُن کی حالت  
دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس بہت اچھی ٹپ ہے۔ قریب ہے کہ اُس پر روپیہ  
لگادیں۔ کہ ایک کانا آدمی پاس سے گذر گیا۔ بیس وہیں رک جائیں گے۔ پ  
کا گھوڑا ون آجائے گا۔ تو نیم سے اُلچھ پڑیں سے: ”تم نے کیوں کہا تھا  
کہ اس گھوڑے پر نہ لگانا — نہیں آئے گا۔“

ایک ملکی، ملکی پر اُن میں عام طور پر ہوتی رہتی ہے جو ان کی ازدواجی زندگی  
میں زندگ بھرتی ہے۔

”پیغم“ لکھنے کے دوران میں مسٹر مکر جی کے ساتھ ایک عجیب منظر پر  
بحث و تجھیس کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ صبح کی  
پہلی گھاڑی ساری ہے تین بجے ملتی تھی۔ میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے  
رخصت چاہی تو نیم نے کہا۔ ”نہیں صفائی ہے یہیں ٹھیہ جاؤ۔ یہ بھی کوئی  
وقت ہے جانے کا۔“

ہم نے بہت کہا کہ کوئی بات نہیں۔ موسم اچھا ہے۔ کچھ دیر پڑیٹ  
فارم پر ہلیں گے۔ اتنے میں گھاڑی آجائے گی۔ مگر نیم اور احسان نے  
بہت اصرار کیا کہ ہم ٹھیہ جائیں۔ مکر جی پڑے گئے۔ اس لئے کہ اُن کے پاس  
موڑتھی۔ اور الحیں بہت دور نہیں جانا تھا۔ میں باہر برآمدے میں سو گیا احنا

دہیں کمرے میں صوف فر پر لیٹ گے۔

صحیح ناشرتہ مرکے جب تھیں اور صفیہ گھر پلے تو راستے میں اس نے  
مجھے یہ بات سنائی جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صفیہ اور نیم سونے کے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک  
پلنگ تھا۔ صفیہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور نیم سے کہا۔ ”آپ سو جائیے۔“  
نیم مسکرائی اور پلنگ پر نئی چادر بھجا نہ لگی۔ ”کپڑے تو بدال لیں۔“  
یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سلینگ سوت نکالا۔ ”یہ تم پہن لو۔ باہل  
نیا ہے۔“

”باہل نیا“ پر زور تھا۔ جس کا مطلب میری بیوی مجھ کی۔ اور لباس تبدیل  
کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ نیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خوابی کا بیاس پہنا۔  
چہرے کامیک آپ اُنمادا۔ تو صفیہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”ہمارے تم کتنی پلی  
ہوئیم۔“

نیم کے پیشکے ہو نڈوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”یہ سب میک آپ  
کی کارستانی ہے۔“

میک آپ اُنماد نے کے بعد اُس نے چہرے پر مختلف روشنیات ملے  
اور ہاتھ دھو کر قرآن اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بیحد متأثر  
ہوئی۔ یہے اغیتار اُس کے مخزے سے نکلا۔ ”نیم۔ خدا کی قسم، تم تو ہم لوگوں  
سے کہیں اچھی ہو۔.....“

اس احساس سے کہ یہ بات اُس نے ڈھنگ سے نہیں کی۔ صفیہ

ایک دم فاموش ہو گئی۔  
قرآن کی تلاوت کرنے سے بعد نیم سو گئی۔  
پری پھر نیم — پکار کی نور جہاں — ملکہ حسن — احسان کی  
ردش — چھپیاں کی بیٹی اور دو پتوں کی ماں۔

# ناشتہ نارے محبت

اشوک کمار

بجم الحسن جب دیو کارانی کو لے اڑا۔ تو بھئی ڈائیکر میں افراتفزی بھیل  
گئی۔ فلم کا آغاز ہو چلا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ  
بجم الحسن اپنی ہیرڈن کو سلو لا یہڈ کی دُنیا سے کھینچ کر حقیقت کی دُنیا میں لے  
گیا۔ بھئی ڈائیکر میں سب سے زیادہ متغیر ہمان سورا تھا۔ دیو بیکارانی کا شور  
اور بیٹے ڈائیکر کا "دل و دماغ پس پر دہ"۔

ایس محرجی جو بلی میکر فلم ساز راشوک کمار کے بہنوی، ان دونوں بھئی  
ڈائیکر میں مدرساؤک و احساؤک انسٹرکٹر کے استٹٹ تھے۔ صرف بہگالی  
ہونے کی وجہ سے انھیں ہمان سورا تھے۔ ہمدردی تھی۔ دہ چاہتے تھے  
کہ کسی نہ کسی طرح دیو کارانی و اپس آجائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آقا ہمان سورا  
سے مشورہ کئے بغير اپنے طور کوشش کی اور اپنی مخصوص حکمت علی۔ دیو بیکارانی  
کو آمادہ کر لیا کہ وہ سلکتے میں اپنے عاشق بجم الحسن کی آنکھوں پھوڑ کر و اپس بیٹے

ٹاکریز کی آنکھ میں پھلی آئے جس میں اُس کے جوہر کے پینپے کی زیادہ گنجائش  
تھی ۔

دیوبیکارانی واپس آگئی۔ ایس مکر جی نے اپنے جذبائی آفایہ انوراء کو بھی اپنی حکمت علی سے آمادہ کر لیا کہ وہ اُسے قبول کر لیں اور بے چارہ بخوبی ان عاشتوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ جن کو یا اسی مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت علیہوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کر دیا تھا۔

ذیر مکمل فلم سے جنم الحسن کو یقینی ہے کاٹ کر تڑی کی ٹوکری میں پھینک تو دیا گیا۔ مگر اب ایہ سوال درپیش تھا کہ عشق آشنا دیوبکارانی کے لئے سیلوولائز کا ہیرو کون ہو ہے؟

انوراء ریک جحمد محنتی اور دوسروں سے الگ تھلک رہ کر خاموشی سے اپنے کامہ من شب دروز ہمک رہنے والے فلم ساز تھے۔ انہوں نے ہبے ٹاکری کی نیوچچہ اس طرح ڈالی تھی کہ وہ ایک باد فار درس کا ہ معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی شہر سے دور مضافات میں ایک چکور ملاد گو۔ اپنی فلم کپنی کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی (جسم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا)

پہاں پھر ایس مکر جی نے اپنے جذبائی آفایی مدد کی۔ ان کا سالا اشٹوک کا بی ایس نبی پاس کر کے ایک درس سلکتے میں دکالت پر طہنے کے بعد بے ٹاکری کی لیباڑ ٹری میں بغیر تنواہ کے کام یکھرا ہوا تھا۔ ناک نفثہ اچھا ہوا۔ پھورٹا

بہت گا بجا بھی لیتا تھا۔ مگر جی نے چنانچہ بریل تذکرہ ہیرد کے لئے اس کا نام  
لیا۔ ہمانورا ائے کی ساری زندگی تجربوں سے دو چار رہی تھی۔ اہنوں نے  
کہا۔ دیکھے لیتے ہیں۔ جو من کیرہ میں درشنگ نے اشوك کا ٹیٹ یا  
ہمانورا ائے نے دیکھا اور پاس کر دیا۔ جو من فلم ڈائرکٹر فراز اوسن کی رائے  
ان کے پر عس تھی۔ مگر بے ڈائیز میں کس کی مجال کہ ہمانورا ائے کی رائے کے  
خلاف الہا پر خیال کر سکے۔ چنانچہ اشوك کمار کانگولی جوان دتوں بتشکل پائیں  
پرس کا ہو گا۔ دیو بخارانی کا ہیرد منتخب ہو گیا۔

ایک فلم بنا، دو فلم بنے۔ کئی فلم بنے اور دیو کارانی اور اشوك کمار  
کا نہ چُدا ہونے والا فلمی جوڑا بن گیا۔ ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئے  
گڑیاں دیو کارانی، اور بڑا ہی بے ضر اشوك کمار اور دنویلو لاںڈ پر شیرد  
شکر ہو کر آتے۔ تو بہت ہی پیارے لگتے۔ معصوم ادائیں۔ اطراف میں  
بڑا ہنسائی قسم کا عشق۔ لوگوں کو جو چار جانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے  
شوقيں تھے۔ یہ زم و نمازک اور پھیلا عشق بہت پسند آیا۔ خاص طور پر اس  
نئے فلمی جوڑے کے گردیدہ ہو گئے۔ اسکو لوں اور کالجوں میں طالبات کا  
(خوب صاؤں دنوں) ایڈیٹریل ہیرد اشوك کمار تھا اور کالجوں کے رٹے کے  
لبی اور کھلی آستینوں والے بستکالی کرتے ہیں کرگاتے پھرتے تھے۔

تو بن کی پڑھیا میں بن کا غمپی بن بن بولوں سے  
میں نے اشوك کے چند فلم دیکھے۔ دیو کارانی اُس کے مقابلہ میں جہاں  
تک کر دا زنگاری کا تعلق ہے۔ میلوں آگے لگتی۔ اور ہیرد کے روپ میں اشوك

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوکو لیٹ کا بنائے ہے، مگر آہستہ آہستہ اُس نے پر پڑنے والے اور بیگانے کے آدرس فرمی عشق کی پئیک سے بیدار ہونے لگا۔

اشوک جب یہاں رہی کی چلن سے باہر نکل کر نظری پر دے رہا۔ تو اُس کی ت Xiao اپنے پر دے مقرر ہوئی۔ اشوک بہت خوش تھا۔ ان دونوں اکیلی جان کے لئے اور وہ بھی شہر سے دور دراز کاؤں "ملاڈ" میں اتنے روپے کافی تھے جب اُس کی ت Xiao ایک دم دگنی ہو گئی یعنی ایک سو چھاپس روپے ماہوار تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھا۔ لیکن جب ڈیرہ کے ڈھانی مقرر ہوئے تو وہ گھبرا گیا۔ اُس نے مجھے اس وقت کی کیفیت بیان کرنے ہوئے کہا۔ "بائی گود۔ میری حالت عجیب و غریب تھی۔ ڈھانی سور روپے میں نے کیشیر سے نوٹ لئے تو میرا ہاتھ کا پنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے روپے کہاں رکھوں گا۔ میرا گھر تھا ایک چھوٹا سا کوارٹ۔ ایک چار پانی تھی۔ دو تین کریں۔ چاروں طرف خنگل رات کو اگر چور آجائے۔ یعنی اگر اُس کو معلوم ہو جائے کہ میرے پاس ڈھانی سور روپے میں۔ تو کیا ہو؟ میں ایک عجیب چکر میں پڑ گیا۔ چوری ڈکھتی سے میری جان جاتی تھی۔ گھر آگر بہت سمجھیں نہیں۔ آخر یہ کیا کہ وہ نوٹ چار پانی کے پیچے بچپی ہوئی دری میں چھپا دینے۔ ساری رات بڑے دراوٹے خواب آتے رہے۔ صبح الہ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹ ڈھانی میں جمع کر دیئے۔"

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پر سنارہ تھا کہ سلسلہ کا ایک فلم ساز اُس سے لئے آیا۔ بکتریکٹ تیار تھا۔ مگر اشوک نے اُس پر دستخط نہ کئے۔ وہ اسی ہزار روپے

ہزار روپے دیتا تھا۔ اور اشوك گمار کا مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا۔  
کہاں ڈھائی سو روپے اور کہاں ایک لاکھ!

اشوک کی ہر دعیزی دن بدن بڑھتی چلی گئی سچونکہ وہ باہر بہت ہی  
کم ملتا تھا اور الگ تعلگ رہتا تھا

اشوگ اپنے عقیدت مندوں سکدالہانہ انہمار کو وصول اور پرواشت کرنے کے معاملے میں بہت ہی ذلیل واقع ہوا ہے۔ فوراً ہی چڑھا گا ہے کہ کسی نے کامی دی ہے میں نے اُس سے کمی دفعہ کہا۔ ”دادا منی تھا یہی حرکت بڑی وابستہ ہے۔ خوش ہونے کے پھرے تم ناراض ہیتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو کہ یہ لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔“ مجریہ بات سمجھنے کے لئے شاید اس کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ نہیں ہے۔

مجتہد سے وہ قطعاً نا آشنا ہے (تفصیل سے پہلے تک کی بات ہے۔ اس عرصہ میں اس کے اندر کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ ہمیں کہہ سکتا ہیں کہ سنگڑوں جیں رہیں اُس کی زندگی میں آئیں۔ مکروہ نہایت ہی روکے انداز میں ان کے ساتھ پیش کیا۔ ٹھیک دوہارہ ایک ٹھیک جاٹ ہے۔ اس کے مکان نہ پہنچنے اور رہنے میں ایک عجیب قسم کا گزارپن ہے۔

دیوکارانی نے اس سے عشق کرنا چاہا۔ مگر اُس نے بہت ہی غیر صفائیانہ انداز میں اُس کی حوصلہ سکنی کی۔ ایک اور ایمیڈیس نے جرأت سے کام لے کر اس کو اپنے گھر بلایا اور بڑے ہی زم دنازک طریقے سے اُس پر اپنی محنت کا انہصار کیا۔ مگر جب اشوک نے بڑے بینڈ سپن سے اُس کا دل توڑا۔ تو اُس غریب کو پیترہ بدلت کر کہنا پڑا۔ "میں آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔"

اشوک کو اس لیکر سلاجم پنڈ تھا۔ ہر وقت دھلی دھلی نکھری رہتی تھی۔ اس کی یہ چیز اشوک کو بہت بھاتی تھی۔ چھاتچہ جھٹنسے قلابازی لگا کر اس کو اپنا بھائی بنایا۔ تو اشوک کو کافی کوفت ہوئی۔

اشوک عشق پریش نہیں۔ لیکن تانک جھانک کا مرض اُس کو عام مردوں کا سا ہے۔ عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ عورت سے دیکھتا ہے۔ اور اُن سے متعلق اپنے درستوں سے باقی بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھار کسی عورت کی جسمانی قربت کی خواہش بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس سے۔ "نمٹو یاد رہت نہیں پڑتی۔"

ہمت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بورا ہے۔ لیکن یہ بوداپن اُس کی آزاد واجی زندگی کے لئے بہت ہی مبارک ہے۔ اس کی یہوی شو بھلے سے اگر اُس کی اس کمزوری کا ذکر کیا جائے۔ تو وہ یقیناً یہی کہے گی۔ "خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی بہت نہیں۔ اور خدا کے یہ ہمت اس میں کبھی پیدا نہ ہو۔" مجھے خیرت سبکے کے اُس میں یہ ہمت اور تبرائتی کیوں پیدا نہ ہو۔ جب کہ

سینکڑوں روکیوں نے جرأت رندازے کام لیکر اُس کو عشق کی آگ میں کوئی  
کی ترغیب دی۔ اس کی ذاتی ڈاک میں بلا بمالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت  
سے بہری خلوط آئے ہوں گے مگر ہم تک میں جانتا ہوں خلوط کے اس انبار  
میں سے اُس نے شاید ایک سو ہی خطا نہیں پڑھے۔ خطا آتے ہیں اس کا مریل  
سینکڑی ڈی سو ڈا اُنھیں مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور دن پن مریل  
ہوتا جاتا رہے۔

تیسم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم چند شکھر کے سلسلہ میں نکلتے ہیں تھا۔  
شہید ہروردی (اس وقت وزیر اعظم بنگال) کے ہاں سے سولہ میٹر فلم لے کر  
کے بعد اپنے ڈریور پر لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں دو خوبصورت ایجکلوانڈ میں  
روکیوں نے اُس کی موڑ روکی اور لفت چاہی۔ اشوک نے چند منٹ کی یہ عیاشی  
توکری مگر اُسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک روکی جو  
شوخ و نیک بیگریٹ کے ساتھ بیگریٹ کیس بھی لے اڑی۔ اس واقعہ کے  
بعد اشوک نے کئی بار سوچا کہ ان سے رسم دراہ پیدا کی جائے۔ بات معمولی  
تھی۔ مگر اُس کی ہستہ نہ پڑی۔

کوٹھاپور میں گرزر اکتوبر اور ڈھال قسم کا بھاری بھر کم ہوتے فلم بن رہا تھا  
اسوک کا تھوڑا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا۔ وہاں سے کئی بلا دے آئے  
مگر وہ نہ گیا۔ اس کی طبیعت اس روں سے بہت منفر تھی۔ جو اُسے اور کئی  
کے لئے دیا گیا تھا۔ مگر کنٹریجٹ تھا۔ آخر ایک روز اُسے جانا ہی پڑا اساتھ  
مجھے لے گیا۔ اُن دنوں میں فلمستان کے لئے "آئھدن" "بھی فلم لکھ رہا تھا۔ چونکہ

نہ فلم اُسے پر وڈیوس اور داڑک کرنا ملتی۔ اس لئے اُس نے کہا۔ ”چلو یار وہاں آرام سے کام کریں گے۔“

مگر آرام کہاں۔ لوگوں کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اشوك کمار کو مٹھا پور آیا ہے۔ چنانچہ اس ہوٹل کے ارد گرد جہاں ہم نہیں تھے۔ زارین جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہوٹل کا مالک ہوشیار تھا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیتا۔ لیکن پھر بعض چیزوں کی قسم کے لوگ ہوٹل کا طواف کرتے رہتے۔ اور اپنے محبوب ایکریک زیارت کر رہی ہیں۔

اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ بہت ہی الھڑ قسم کا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں ان کا ردِ عمل کیا تھا۔ مگر بیٹھ ایک ناظر کے مجھے سخت کوفت ہوتی ملتی۔

ایک شام ہم دونوں سیر کو نکلے۔ اشوك ”کیموفلاز“ کے تھا۔ آخر ہوئے پرچوڑا چلا گھر سے رنگ کا چمنہ۔ ایک ہاتھ میں چھڑی۔ دوسرے ہاتھ میں راندھا۔ تاکہ حسبِ ضرورت مجھے آگے پہنچے کر سکے۔ اسی طرح ایک اسٹور میں پہنچے۔ اشوك کو کولہاپور کے اسٹیل ڈیو کے گرد وغیرے کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی دو اخیر یہ ناملتی۔ جب اُس نے اسٹور دائیے یہ طلب کی تو اُس نے سرسری نظر سے اپنے ٹاکہ کی طرف دیکھا اور اداری کی طرف بڑھا۔ لیکن فوز آہی ”ڈی یڈا لیشن“ بھم کی طرح پھٹا۔ اور مرہکے اشوك کے مقابلہ ہوا۔ ”آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟“

اشوك نے جواب دیا۔ ”میں کون ہوں؟۔۔۔ میں دہی ہوں جو

کہ میں ہوں؟"

اسٹور والے نے خور سے اشوك کے چشمہ اور ٹھیک چہرے کی ڈرف دیکھا۔ "آپ اشوك کمار میں ہیں؟" اشوك کمار کوئی اور ہو گا۔  
چلو منشو۔"

یہ کہہ کر اس نے میرے کندھ پر ہاتھ رکھا۔ اور دو اخڑیے بغیری بہ دوں اسٹور سے باہر تھے۔ ہوش کاموڑہ مرٹنے لگے۔ تو سامنے تین مرہی رٹیاں نزدیکی میں۔ بہت صاف ستھری۔ گوری چھٹی۔ ماہتوں پر کم کم۔ بالوں میں دیساں (بچوں کے بھرے) پر دل میں ہلکے پھلکے چلپ۔ ان میں سے یک جس کے ہاتھوں میں موبیاں تھیں، اشوك کو دیکھ کر زور سے کانپی، بھینجی ہوئی آواز میں اس نے اپنی ہمیلیوں سے کہا۔ "اشوك ۱" اور اس کے ہاتھوں کی ساری موبیاں سڑک پر گرپیں۔ اشوك نے میراں کندھا چھوڑا اور بھاگ گیا۔ اشوك سے میری پہلی ملاقات فلتان میں ہوئی۔ جب ایک عربی کی پوری لمبے بیسی میکر چھوڑ کر اپنا نیا فلمی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ یوں تو میں نے کئی بار اس کی جعلکیاں دیکھی تھیں۔ مگر اس سے مفصل ملاقات فلتان ہی میں ہوئی۔ جب میاداں ملازم ہو گیا۔

فلمی دنیا کی بہترنیست پر دے پر کچھ اور پر دے سے دو رکھہ اور ہی ہوتی ہے۔ اشوك کو چھانچ جب میں نے پہلی بار قریب سے دیکھا تو پر دے کے اشوك سے بہت مختلف تھا۔ گھرا سا نولازگ۔ موٹے اور کھرد رہے ہاتھ۔

مفضو ط کرتی جسم نیم گزار لب دل بھے۔ اکھڑا اکھڑا یغز قظری ت مختلف۔ تعارف کرایا  
سیا توہین نے اس سے کہا۔ ”اپ سے مل کر بڑی مشترت ہوتی ہے۔“

اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا۔ وہ موٹے موٹے الفاظ پر  
تھا۔ ایسا لکھا تھا جیسے اُس نے یہ لفظ رکھے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ فلستان میں ایک صاحب اشٹریوں میں سیر و تفریح کے لئے آئے  
آپ نے بڑے پر مختلف انداز میں اشوک سے کہا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہوتا  
ہے کہ خاکسار کو اس سے پہلے بھی جانب سے شرق ملقات حاصل ہو چکا  
ہے۔“

اشوک نے گڑ مدد بھجے میں جواب دیا۔ ”ہی... جی مجھے کبھی مقابلہ  
نہیں ہوا۔“ مقابلے کا قاف اُہنوں نے طق سے نکالا۔۔۔ لیکن فوراً ہی اس  
کو احساس ہوا کہ اُس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اُرد و بہت اچھی لگتی ہے۔ شروع شروع میں اُس نے  
اس زبان میں لکھا پر صفا شروع کیا۔ مگر قاعدے سے آگئے نہ بڑھ سکا۔  
پھر بھی اُس کو تھوڑی سی شدید ہے۔ ایک دو سطر اُرد و میں لکھ لیتا ہے نقیم  
کے بعد جب میں اُس سے چھوڑ کر بے ماکر سے چلا آیا۔ تو اُس نے مجھے اُرد و  
میں ایک خط لکھا کر دا پس آجائے۔ مگر انہیں ہے کہیں چند در چند وجہ کے  
با عث اس کا جواب نہ دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عورتوں کی طرح اشوک کمار کی بہت مدّع  
تھی۔

ایک دن اشوک کو میں اپنے گھر لے آیا۔ مگر میں داخل ہوتے ہی میں نے زور سے آواز دی۔ ”صیفیہ — آڈا شوک گلار آیا ہے۔“ صیفیہ اندر روٹی پکار بیٹھی۔ جب میں نے پے در پے آوازیں دیں تو وہ باہر نکلی۔ میں نے اشوک سے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ میری بیوی ہے دادا منی — ہاتھ ملاؤ اس سے۔“

صیفیہ اور اشوک دونوں تجھیں پہنچ گئے میں نے اشوک کا باطنہ پڑھ لیا — ”ہاتھ ملاؤ دادا منی — شرمائی کیا ہو۔“

محبو راؤ اُسے ہاتھ ملانا پڑتا۔ اتفاق سے اُس روز تھے کی روپیاں تیار کی ہی رپی تھیں۔ اشوک کھا کر زیاد تھا مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین ہرپ سرگی یہ غمیب بات ہے کہ بیٹے میں اس کے بعد جب کبھی ہمارے یہاں تھے کی روپیاں تیار ہوتیں۔ اشوک کسی نہ کسی طرح آن موجود ہوتا۔ اس کی توجیہ میں کر سکتا ہوں نہ اشوک۔ دا نے دا نے پر بہر والای قدر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادا منی کہا ہے۔ بنکھے میں اس کا مطلب ہے بڑا بھائی۔ اشوک سے جب نیرے مراسم برداشت گئے۔ تو اس نے مجھے مجبور کیا۔ کہ میں اُسے دادا منی کہا کرو۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”تم بڑے کیسے ہونے سماں کرو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔“

حباب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا مکلا۔ چنانچہ اشوک اور مسٹر گانجولی کے بجائے مجھے دادا منی کہنا پڑتا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا لیکن کوئی اس میں بنکایوں کی خوب بٹھائی۔ رس گلے ”کی سٹھاں اور گولائی تھی۔ وہ

مجھے پہلے سڑمنڈو کہتا تھا۔ جب اُس سے دادا منی کہنے کا معاہدہ ہوا۔ تو وہ مجھے صرف منڈو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے یہ ناپسند تھا۔

پر وہے پر وہ مجھے چاکو لیٹ، ہیر د معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب میں نے اس کو سلوالٹ کے خول سے باہر دیکھا۔ تو وہ ایک کسر قی آدمی تھا۔ اُس کے کئے میں آنی قوت ملتی۔ کہ دروازے کی لکڑی میں شکاف پڑ جانا تھا۔ بہرہ زنگر پر باکنگ کی مشن کرتا تھا۔ شکار کھیلنے کا شوقین تھا۔ بخت سے سخت کام کر سکتا تھا۔ افسوس مجھے صرف اس بات کا ہوا کہ اُسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کا گھر دیکھ سے دیکھ ساز و سامان سے آرائستہ ہوتا۔ مگر اس طرف وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا۔ اور اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج فیر صناعات ہوتے تھے۔ برش اٹھا کر خود ہی سارے فریضے پر گھرا نیلا ہینٹ تھوپ دیتا۔ یا کسی صوفی کی پشت توڑ کر اُسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیتا۔

مکان سندھ کے ایک غلینظ کنارے پر بے نجیں پانی کی چھینٹے باہر کی کھڑکیوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ لوہے کے کام پر زنج کی پپڑیاں جبی ہیں۔ ان سے بڑی اُداسی پھیلانے والی بو آر ہی ہے۔ ملحوظ اس کے قطعاً غافل ہے۔ ریغ بیجیڑ کو رہی ڈور میں پڑا جھک مار رہا ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر اُس کا گرانڈلیشن ستاورہ ہے۔ پاس کرے میں بچے اور ہمچارہ ہیں۔ اور اشوک غسل خانہ کے اندر پاٹ پر بیٹھا دیوار دی پر حساب لکھا کر دیکھ رہا ہے۔ کہیں میں کون سا گھوڑا دن آئے گا۔ یا مکالہ

کا پرچمِ تحریم لئے اُن کی ادائیگی سوچ رہا ہے۔ اشوك کو فراست ایسی یعنی پارسی  
اور علم بخوبی سے خاص شغف ہے۔ مونخر الد ذکر علم اُس نے اپنے باپ سے برکھا  
ہے۔ متعدد کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پر  
انے دوستوں کی جنم پتیراں دیکھا رہا ہے۔

میرے تاروں کا مطالعہ کر کے اُس نے ایک دن مجھ سے ترسی طور پر پوچھا۔ ”تم شادی شدہ ہو؟“

میں نے اس سے کہا۔ ”تھیں معلوم نہیں؟“

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "میں جانتا ہوں ۔۔۔ لیکن دیکھو منٹو، ایک بات بتاؤ ۔۔۔ ہیں ۔۔۔ تمہارے توابی اولاد ہیں ہوتی ۔۔۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بات کیا ہے ۔۔۔ تماڈ تو ہی۔“

اُس نے بچکپن تھے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں — جن لوگوں کے تاریخ  
کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لڑکا ہوتی ہے۔ . . . مگر وہ زندہ  
نہیں رہتی۔“

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔  
اشوک نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس کا پہلا پچھہ جو کہ رڑکا تھا مردہ پیدا  
ہوا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ تھارے اور میرے تاروں کی پوزیشن  
فریب قریب ایک چیزی ہے۔ اور یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے  
تاروں کی پوزیشن ایسی ہو۔ ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا نہ ہو۔ اور وہ

نہ مرے۔

اشوک کو علم بخوم کی صحت پر پورا پورا یقین ہے۔ بشر طیکہ حساب بہت ہو۔ وہ کہا کرتا ہے: ”جس طرح ایک پائی کی کمی بیشی حساب میں گرفڑ کر دیتی ہے اس طرح تاروں کے حساب ہیں معمولی سی غلطی ہیں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلتوں کے ساتھ تو فی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہیئے۔ یکو نکہ ہو سکتا ہے۔ جنم سے سہو ہو گیا ہو۔“

ریس کے گھوڑے کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک ایسے علم سے مدد لیتا ہے۔ یعنی وہ ردم میں بیٹھا حساب لے کا تارہتا ہے۔ مگر پوری ریس میں سور و پے سے زیادہ اُس نے کبھی نہیں کھیلا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دہ بیشہ بیتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو سکے سو کے سو ہی رہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اُس کے تلو میں سے ایک پائی کم ہوئی ہو۔ وہ ریس جیتنے کے لئے نہیں محض تفریح کے لئے کھیلتا ہے۔ اس کی حسین و جیل ہیوی شو بھاہیشہ اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ بہر ز انکلوثریڈ میں داخل ہوتے ہی دہ ایک کونز میں الگ تھلک بیٹھ جاتا ہے۔ ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی ہیوی کور و پے دیتا ہے۔ کہ فلاں فلاں بہر کے ٹکٹ لے آؤ۔ جب ریس ختم ہوتی ہے تو اُس کی ہیوی ہی کھڑکی پر جا کر جیتنے والے ٹکٹوں کے روپے وصول کرتی ہے۔

شو بھاہ گھر بیوی عورت ہے۔ تعلیم داجی ہے۔ اشوک کہا کرتا ہے۔ کہ ان پر ٹھہر ہے۔ مگر صرف از راہِ مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت

کامیاب ہے شو بجا آتی دولت ہونے کے باوجود کام کا تین مشغول رہتی ہے۔ ٹھیک نگایوں کی طرح سوچی دھو قی پہنے اُس سکے پلوکے ایک کونے میں چاہیوں کا یہ بڑا چھا اڑ سے دہ بھیشہ اپنے لھر میں مصروف کا رنظر آتی ہے شام کو جب کجھی وسکی کا دور چلتا تو سگر کی چیزیں شو بجا اپنے ہاتھے سے تیار کرتی تھیں کبھی نمیں پارے کبھی بھنی ہوئی دال کبھی آلوؤں کے قلے۔ میں ذرا زیادہ پہنیے کا عادی تھا۔ اس لئے شو بجا اشوک سے کہتی تھی — ”دیکھو کانگویی اسٹرمنٹو کو ذیادتی مت دینا۔ منٹرمنٹو ہم کو بولیں گی ۔“

منٹرمنٹو اور منٹر کانگوی دو نوں سہیلیاں تھیں۔ ان سے ہم دونوں بہت کام نکالتے تھے۔ جنگ کے باعث ہر بڑے اپنے سگر ٹپ قریب قریباً ناپید تھے جنے بھی باہر سے آتے تھے۔ سب کے سب ملیک میں پلے جاتے تھے یوں تو ہم عام طور پر اس ملیک مارکٹ ہی سے اپنے لئے سگر ٹپ حاصل سرتے تھے۔ مگر جب کسی دستیلے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی۔ تو ہم عجیب و غریب سرت محسوس کرتے۔

منٹر کانگوی جب شونپک کرتے تھلتی۔ تو میری بیوی صفیہ کو کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے دو کانڈار کو معلوم تھا کہ منٹر کانگوی لشہر ایکٹر اشوک کمار کی بیوی ہے۔ چنانچہ اس کے طلب کرنے پر ملیک مارکٹ کی ماریک ہیوں میں چھپی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی فائدہ اٹھایا۔ مگر

دوسرے بعض اوقات اُس کے علم کے بغیر اُس کے ذریعے سے اپنا اتو  
سیدھا کر لیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خان نے ایک دفعہ بڑے ہی ونجپ طریقے  
سے اپنا اتو سیدھا کیا۔

راجہ فلستان میں ملازم تھا میں فلستان پھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک  
کہانی لکھ رہا تھا۔ ایک دن مجھے ٹیلیفون پر اشوك کے سیکرٹری نے بتایا کہ راجہ  
مہدی علی خان بیمار ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بڑی حالت ہے لگا  
اس قدر خراب ہے کہ آواز ہی نہیں نکلتی۔ تقاضت کا یہ عالم ہے کہ سہارا کے  
کربجی اٹھا نہیں جاتا۔ اور آپ نے یمن پانی کے غزاروں اور اورنگیل بام کی  
ماش سے اپنا مرض دور فرمائے کی کوشش ہر رہے ہیں۔

مجھے شبہ سا ہوا۔ کہیں دی پتھیر یا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے الخس فوراً ہی لا دا  
اور اشوك کو ٹیلیفون کیا۔ اُس نے مجھے اپنے ایک واقع کارڈ اکٹر کا نام بتالیا  
کر دیا لیجاو۔ میں راجہ صاحب کو دہان لے گیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا۔ کہ  
دائی دبی موذی مرض ہے۔ ذاکٹر صاحب کے مطابق میں نے نوراً ہی متعددی  
امراض کے ہستہاں میں داخل کر دیا۔ یہکے دیگرہ دئے گئے۔ دوسرے روز  
صبح میں نے اشوك کو ٹیلیفون پر راجہ کے مرض کی نویست بتائی۔ جب اُس  
نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی تو مجھے غصہ ہلیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ ایک اور می  
ایسے خونتاک مرض میں مبتلا ہے سچا ہے کا یہاں کوئی پرساں حال بھی نہیں  
اور تم کوئی بچپی، ہی نہیں لے رہے ہے۔

اشوك نے جواباً هرف اس قدر کیا۔ ”آج شام کو پیس گے اس کے پاہ“

ٹیلیفون بند کر کے میں بہتال پہنچا اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے سی نسبت کسی قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے جو ٹیکے کے تھے وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اُس کے والے گر کے اور دم دلا سہ دے گر اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوك نے مجھے دلی کے دفتر میں پڑھ لیا۔ میں ناراض تھا۔ مگر اُس نے مجھے منایا۔ موڑ میں بہتال پہنچے۔ اشوك نے راجہ سے معاذرت طلب کی کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ اب صراحت کی باتیں ہوئیں اُس کے بعد اشوك مجھے لگھر جھوڑ چلا گیا۔

ددھرے روز بہتال پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ، راجہہ بنا بیٹھا ہے بستر کی چادر اُبھی۔ ٹیکے کا خلاف اُبلا۔ سکریٹ کی ڈبیار پان، سرہانے کے دندوسل پر پھول دان۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بہتال کا صاف سخرا جوڑا پہنچے، بڑے یہا شانہ طور پر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے جھرت ہبرے لپجھ میں اُس سے پوچھا۔ “لیکوں راجہ۔ یہ سب کیا؟”

راجہ مسکرا یا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونجیں لھرائیں۔ “یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ابھی اور دیکھنا؟”

میں نے پوچھا۔ “کیا؟”  
 ”یہا شی کے سامان۔ پھر روز اور میں یہاں رہا تو تمزیکوئے کر پاس والے کمرہ میں میری حرم صراۓ ہو گی۔ خدا ہمیار کئے میرے اشوك کار کو۔ تباہ وہ کیوں نہیں آیا؟“

لھوڑی دیر کے بعد راجہ نے تباہ کا وہ سب پچھا اشوك کا نور نہور ہے م

ہسپتال والوں کو پہلے چل گیا کہ اشوك اُس کی بیمار پرنسی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ ہر چھوٹا بڑا چہ کے پاس آیا۔ ہر ایک نے اُس سے ایک ہی ختم کے متعدد سوال سکتے۔

”دیکھا اشوك دا تھی اس کی بیمار پرنسی کے لئے آیا تھا؟“

”اشوك سے اُس کے کیا تعلقات ہیں؟“

”دیکھا وہ پھر آئے گا؟“

”لگب اور کس وقت آئے گا؟“

راجہ نے ان کو بتایا کہ اشوك اس کا بہت ہی گہرا دوست ہے اُس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہے۔ وہ ہسپتال میں اُس کے ساتھ ہی رہنے کو تیار تھا۔ ملکر ڈاکٹر نہ مانتے۔ صبح شام آنا ملکر کنسرٹ پکھا زیبے ہیں کہ مجبور ہیں۔ آج شام کو ضرور آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیراتی ہسپتال کے خیراتی کمرے میں اس کو برصغیر کی سہولت میسر تھی۔

وقت ختم ہونے پر میں جانے ہی دالا تھا کہ میڈیکل اسٹوڈنٹ راکیوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا۔ .... راجہ مسکرا یا۔

”خواجہ ... جرم نہ رانے کے لئے یہ ساتھ والا کمرہ میرا خیال ہے چھوٹا رہے گا۔“

اشوك بہت اچھا ایکھڑا ہے، ملکر وہ اپنی جان پہچان کے بے تکلف لوگوں کے ساتھ مل کر بی پوری دلجمی۔ سے کام کر سکتا ہے۔ ہی وہ جو ہے کہ ان فلموں میں اُس کا کام اٹھنے کا بخش نہیں ہے۔ جو اُس کی یہم نے

نہیں بنائے۔ اپنے لوگوں میں ہوتودہ کھل کر کام کرتا ہے۔ ٹیکنیشنز کو مشورے دیتا ہے، اُن کے مشورے قبول کرتا ہے۔ اپنی ایٹمنگ کے متعلق لوگوں سے استفسار کرتا ہے۔ ایک سین کو مختلف شکلوں میں او اکر کے خود پڑھتا ہے اور دوسروں کی رائے لیتا ہے۔ اس فضائے اگر کوئی اُسے باہر بیجا آتا ہے۔ تو وہ بہت انجمن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بھی ٹائیز ہی بادوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک نسلک رہنے کی وجہ سے اشوك کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے دائمیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ کیرہ کی باریکیاں جانتا تھا پیسار ٹری کے پھریدہ مسائل بحث تھا۔ ایٹمنگ کا علی بخوبہ رکھتا تھا۔ اور ڈائرکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ فلمستان میں جب اُس سے رائے بہادر چوفی لال نے ایک فلم پر دیوں کرنے کے لئے کہا۔ تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

ان دنوں فلمستان کا پرد پیکنڈ اٹھ کر فلم "شکاری" میکھ ہو چکا تھا۔ اس لئے میں کئی بھینزوں کی لکھتا مرحبت کے بعد گھر میں چھٹیوں کے مزے اڑا رہا تھا۔ ایک دن سادک دا چا اُتے۔ ادھر اُدھر کی پائیں کرنے کے بعد کہنے لیکے سعادت.... ایک کہانی لکھ دگنگوی۔ کے لئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ سادک کا کیا مطلب ہے۔ میں فلمستان کا ملازم تھا۔ اور میرا کام ہی کہانیاں لکھنا تھا۔ گنگوی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے سادک کی سفارش ہے۔ ایک نزدیکی تھے۔ مجھ سے وہاں فلمستان کا کوئی ذمہ دار رکن

بھی کہتا، میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوك چونکہ فلم خود پر دیوپس کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس کی خواہش ہے کہ میں اس کی خواہش کے مطابق کوئی نہایت ہی اچھوئی کہانی لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے نہ آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سن چکا تھا۔

بہر حال ساڈک کے ساتھ وقت مقرر ہوا اور ہم سب ساڈک ہی کے صاف سترے فیلٹ میں جمع ہوئے۔ اشوك کو کیسی کہانی چاہئے تھی۔ یہ خود اُس کو معلوم ہنس تھا۔ ”بس نٹو ایسی کہانی ہو کہ مزا آجائے آنے خیال رکھو کہ یہ میرا پہلا فلم ہو گا۔“

ہم سب نے مل کر گھنٹوں مغز پاشی کی، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

دن بھر کی سعی ناکام کی کوفت دور گرنے کے لئے شام کو باہر میں پر براںڈی کا دور مشرد ع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساڈک دا چاہبہت ہی عمدہ ذوق کا مالک ہے۔ براںڈی چنانچہ ذاتی اور قوام کی بہت اچھی تھی۔ جلت سے اُترنے بھی لطف آگیا۔ سامنے چڑپ گیٹ اٹیشن تھا۔ پچھے بازار میں خوب چھل پہل تھی۔ اداھر بازار کے اختتام پر سمندر اوندھے منہ ٹیکستار ہاتھا۔ بڑی بڑی قسمی کاریں ٹرک کی چمکیلی سطح پر تیر رہی تھی۔ ... تھوڑی دیر کے بعد ایک ہانپتا ہوا سریں کوئے دالا انجن نمودار ہوا... میں نے ایسے ہی سوچا... خدا معلوم کھالنے سے یہ خیال میرے دماغ میں آن پیکا کہ اگر اس پیرس سے کوئی راک ایک رقص گرانے اس نیت سے کہ وہ جس کے ہاتھ لگے گا۔ وہ اُس سے شادی کرے گی۔ تو کیا ہو؟ ...

ہو سکتا ہے کہ رقصہ کسی پیکار ڈھونڈ میں جاگرے ..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اڑتا اڑتا سڑکیں کو ٹھنے والے ابجن کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے ..... ہو سکنے کا یہ سلسلہ کتنا دراز تھا اور کتنا لچک پ۔

میں نے اس کا ذکر اشوك اور سادک سے کیا۔ اُن کو مزا آئی۔ اور مزا یعنی کی خاطر ہم نے بر انڈی کا ایک اور دور چلا یا اور بے لحاظ خیال ک رایا شروع کر دیں۔ جب مغل برخواست ہوئی تو ملے پایا کہ کہانی کی بُنیا دیں اسی خیال پر استوار کی جائیں۔

کہانی تیار ہو گئی۔ مگر اس کی تکملہ کچھ اور بقی۔ حینہ کا لکھا ہوا رقصہ نہ رکھنے سڑک کو بننے والا ابجن۔ پہلے پہلے خیال تھا کہ ڈریجڈی ہونی پاہیئے مگر اشوك چاہتا تھا کہ کو میدی ہو۔ اور وہ بھی بہت تیز زمانہ، چھانپہ دماغ کی ساری قوتیں اسی طف صرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی۔ تو اشوك کو پند آئی۔ شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب فلم کا ایک ایک فیم اشوك کی بدايات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "آٹھو دن" تمام و کمال اشوك کی ذرا ٹکش کا نتیجہ تھی۔

اشوك جتنا اچھا گردار کا رہے اتنا ہی اچھا ہدایت کا بھی ہے۔ اس کا علم مجھے آٹھو دن" کی شوٹنگ کے دوران میں ہوا۔ معمولی سے عمومی نظر پر بھی دہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظریانی کیا ہوا۔ سین لیتا اور غسل خانے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس کی نوک پلک پر غور کرتا رہتا۔۔۔ نیچے بھیب بات ہے کہ باہر دوام کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ

سے فکر ملب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بھلوں کی تپشیں ہوئے۔ راجہ ہندی علی خاں اور پندرنا تھا اشک، محسن عبد اللہ در پر اسرار زینا کے سابق شوہر، اور راقم الحرف ٹھے یہ ہوا کہ ایسے مکر جی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آنے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے کوئی کام کرنے سے انتحار کر دیا تھا۔ مکر جی کو بہانہ ہاتھ آیا دراصل وہ خود مکرے سے خوف زدہ تھے۔

آن کا رد ایک "شل شوکڑ" فوجی کا تھا۔ اُس سے لئے لباس وغیرہ سب پیارے تھے۔ جب مکر جی نے انتحار کیا تو اشوك بہت سُپھا یا کہ اُن کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔ کئی دن شومنگ بند رہی۔ رائے بہادر چونی لال جب لال پیلے ہوئے لگے۔ تو اشوك میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دو بارہ لکھ رہا تھا۔ اُس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا۔ "پلو منٹو...."

میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیت کی رُعن سنوانے لے جا رہا ہے۔ مگر وہ مجھے سیٹ پر لے گیا۔ اور کہنے لگا۔ "پاگل کا پارٹ تم کرو گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ مکر جی انتحار کر چکا ہے۔ اور اشوك کو اس خاص دل کے لئے کوئی آدمی نہیں مل رہا، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کہے گا کہ میں یہ رول ادا کر دوں۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو" اشوك سمجھ دیا۔

ہو گیا اور کہنے لگا کہ نہیں منٹو تھیں یہ ردی لینا ہی پڑے گا۔ راجہ ہندی علیخاً اور اوپندر ناٹھ اشک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا: ”تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنایا۔ حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا۔ یکیونکہ میں اشوک کی عزت کرتا ہوں۔ تم پاگل بن جاؤ گے تو کون سے آفت آ جائے گی؟“

اس پر مذاق شروع ہو گیا۔ اور مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو پاگل فلاٹ نفٹٹھ کر پارام بن گئے۔ ... بھرے کے سامنے میری جو حالت ہوئی اس کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

غلام تیار ہو کر نمائش کے لئے پیٹ پہوا تو کامیاب ثابت ہوا۔ ناقدین نے اُسے بہترین کامیڈی فرار دیا۔ ... میں اور اشوک خاص طور پر بہت ہی سر درستھے۔ اور ہمارا ارادہ تھا کہ اب کی کوئی نئے ٹائم کی فلم بنایں گے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ساڈک دا چاہا ”آٹھوون“ کی شوٹنگ کے آغاز ہی میں اپنی والدہ کے علاج کے سلسہ میں لندن چلا گیا تھا۔ وہ جب دا بیس آیا تو نامی صفت میں ایک اتفاق بہ پا ہو چکا تھا۔ کئی اداروں کے دیوارے پٹھ گئے تھے۔ بھئی ماکیز کی نہایت ابر حالت تھی۔ ہماں سوراۓ آنجمانی کے بعد دیو کاران چند برسوں کی عدت کے بعد ایک روئی سے رشتہ ازدواج قائم کر کے فلمی دینا یا اسکے لئے تھی۔ دیو کارانی کے بعد بھئی ماکیز پر کئی بیرد فی جملہ آؤ رہوں نے قبضہ کیا۔ مگر اس کی حالت سدھا رہنے سکے۔ آخر ساڈک دا چاہا لڈن سے

واپس آئے۔ اور جرأتِ رندانہ سے کام لے کر بھئی ڈاکٹر کی عنان حکومت اشوك کی مدد سے اپنے ساتھ میں لے لی۔

اشوك کو فلستان چھوڑنا پڑا۔ اس دوران میں لاہور سے مسٹروں نے بھئی گذر دافی نے تاریکے ذریعے سے ایک ہزار روپے ماہوار کی اور فردی میں چلا گیا ہوتا۔ مگر مجھے سادک کا انتظار تھا۔ جب اشوك اور وہ دونوں بھئی ڈاکٹر میں اکٹھے ہوتے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ دہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے انگریز رف کا پیوس پر نتیجے بنارہ تھا۔ بھس میں خلی ڈال جاؤ الگ گھر طی ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے جگہ بنارہی تھی۔

میں نے جب بھئی ڈاکٹر میں قدم رکھا تو ہندوں کی فسادات شروع ہئے۔ جس طرح کرکٹ کی میچوں میں دکھیں اڑتی ہیں باڈنڈریاں لگتی ہیں۔ اس طرح ان فسادات میں لوگوں کے سر اڑتے ہئے اور بڑی بڑی آگیں لگتی تھیں ۔ ۔ ۔

سادک واپسی نے بھئی ڈاکٹر کی اپنی حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جب انتظامِ سینھالا تو اُسے بہت سی مشکلیں درپیش آئیں۔ غیر ضروری عذر کو جو کہ مذہب کے لحاظ سے ہندو تھا، انکا باہر کیا تو کافی گڑبرڑ ہوئی۔ مگر جب اُس کی جگہ پر کی گئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کلیدی آسایاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا۔ شاہدِ بیف تھا۔ عصت چھائی ملتی۔ کمال امر و ہوی تھا، حسرتِ بھنوی تھا۔ نذرِ اجیری، نظمِ پانی پتی اور میوزک ڈائرکٹر غلام حیدر تھے۔ یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کارکنوں میں سادک دا چا اور

اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ یہ نے اشوک سے اس کا ذکر کیا تو وہ ہنرنے لگا۔ ”میں واچا سے کہد دیں گا۔ کہ وہ ایک دُانٹ پلا دے۔“

ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر اٹھا ہوا۔ واچا کو گرام خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے اشٹیو سے مسلمانوں کو باہر نہ بکالا تو اس کو آگ لکھادی جائے گی۔ یہ خط واچا پڑھتا تو آگ بگولا ہو جاتا۔ ”سالے مجھ سے کہتے ہیں۔ میں غلط پڑھ رہوں۔۔۔ میں غلط پڑھوں۔۔۔ میں غلط پڑھوں تو ان کے پادا کا کیا جاتا ہے۔۔۔ آگ لکائیں تو میں ان سب کو اُس میں جھونک دوں گا۔“

اشوک کا دل ددماغ فرقہ دارانہ تھقب سے بالکل پاک ہے۔ وہ بھی ان خطوط پر سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پر آگ لگانے کی دھمکیاں دینے والے سوچتے تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا۔ ”منٹو! یہ سب دیوانگی ہے۔۔۔ آہستہ آہستہ دور ہو جائے گی۔“

گر آہستہ آہستہ دور ہونے کے بجائے یہ دیوانگی بڑھتی بی پلی جا رہی تھی۔ اور میں خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ اس لئے کہ اشوک اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتے تھے، اس لئے کہ ان کو میرے خلوص پر بھر دہ تھا۔ لیکن میرا یہ خلوص میرے اندر شکر درہ تھا۔۔۔ میں سوچتا تھا۔ اگر بیٹے مایکز کو کچھ ہو گیا۔ تو میں اشوک اور واچا کو کیا منور کھاؤں گا۔

نادات زور دی پڑتے۔ ایک دن میں اور اشوک بھئی مایکز سے واپس

اُر ہے لئے۔ راستے میں دیر تک اُس کے گھر بیٹھے رہے۔ شام کو اُس نے  
کہا۔ چلو میں تھیں پھوڑ آؤں..... شورٹ گل کی فاطر وہ موڑ کو ایک  
خالص اسلامی محلے میں لے گیا۔ سامنے سے ایک برات آرہی تھی۔ جب  
میں نے بند کی آواز سئی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوك  
کا ہاتھ پڑ کر میں چلا یا۔ ” دادا بھنی ” یہ تم کہ دھرا نگلے ۔ ”

اشوک میرا مطلب سمجھے گیا۔ مسکرا کر اُس نے کہا۔ ” دو کوئی فکر نہ کر د ”  
میں کیوں نکر فکر نہ کرتا۔ موڑ ایسے اسلامی محلے میں تھی جہاں کبھی ہندو ہاگز  
ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اشوک کو کون نہیں پھیانتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ ....  
ایک بہت بڑا ہندو ..... جس کا قتل معمر کہ خیز تھا۔ .... مجھے عربی زبان میں  
کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی  
دل ہی لمبیں اپنے اور پیشیں بیٹھ رہا تھا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی بیان  
میں بے جوڑ سی دعائیں اگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سر خود رکھ ۔ ....  
ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے۔ اور میں ساری عمر اُس کا خون اپنی  
گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی۔ مگر  
یہ ایسی ذلیل حرکت کے لئے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ  
سے تھجکنا نہیں چاہتی ۔

جب موڑ برات کے جلوس کے پاس بہنچی تو لوگوں نے چلانا شروع کر  
دیا۔ ” اشوک کمار ۔ اشوک کمار ۔ ” میں بالکل بیخ ہو گیا۔ اشوک  
اسٹرینگ پر ہاتھ کئے غاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی تباہی سے محل

بجوم سے یہ سکنے والا تھا کہ رکھو ہوش کر د۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے  
میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے .... کہ دو نوجوانوں نے آگے پڑھ  
کر بڑے آرام سے کہا۔ ”اشوک بھائی آگل راستہ نہیں ملے گا اور  
با جو کی گلی سے پلے جاؤ۔“

اشوک بھائی، اشوک اُن کا بھائی تھا۔ اور میں وہ تھا ب....  
میں نے دفعتہ اپنے بس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا۔ .... معلوم  
نہیں اُنہوں نے مجھے کیا سمجھا ہو گا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے اشوک  
کی موجودگی میں مجھے دیکھا ہی تھا ہو۔

موڑ جب اسلامی محلے سے نکلی تو میری جان میں جان آئی۔ میں  
نے اشہد کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسا۔ ”تم خواہ مخواہ گھبرا گئے  
آرٹسٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے۔“

چند روز بعد بیٹے ڈائیکٹر میں نزیر اجمیری کی کہانی رجو ”مجهد“ سے  
نام سے فلم بند ہو گئی پر میں نے جب کڑی نکتہ پیشی کی اور اس میں کچھ  
تبديلیاں کرنا چاہیں، تو نزیر اجمیری نے اشوک اور داچا سے کہا۔ ”متو  
کو آپ ایسے بھاٹھوں کے درمیان میں نہ بھایا کریں۔ وہ چونکہ خود افسانہ  
نویس ہے اس لئے مستحب ہے۔“

میں نے بہت سوچ کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے  
کہا۔ ”منو بھائی۔ آگل راستہ نہیں ملے گا۔ کار موڑ روک کو  
— ادھر با جو کی گلی سے پلے جاؤ۔“

اور میں پُچھ چاپ باجوکی گئی سے پاکستان چلا کیا۔ جہاں میرے  
افانے ”خند اگوش“ پر مقدمہ چلایا گیا۔

# تایی کاششام

اپریل کی تیس یا چوبیں بھی۔ مجھے اپنی طرح یاد نہیں رہا۔ پانچل خلنے میں شراب چھوڑنے کے سلسلہ میں زیر علاج تھا کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دونوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ دیں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے۔ اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح گذرا ہو گئی تھیں کہ میں خود کو ”نوینز لینڈ“ میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظر دی سے گزری۔ تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب تر کثرب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں پانچل پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کبھی عزیز دی کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں اور نیم ہوشمندی کے و

مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں اور یہی محنت کے لئے دعا میں مانگ رہے ہیں۔

مجھے اپنی طرح یاد ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساتھ دائے گئے کے یا مکمل سے کہا۔ ”جانتے ہو۔ میرا ایک ہنایت ہی عزیز روت مرگیا ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”کون؟“

میں نے لگو گیر آواز میں کہا۔ ”شیام۔“

”کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پرستے کی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں اُبھریں۔ جن میں شیام تھا مسکرا تاشیام۔ ہنسنا شیام؛ سورچھاتا شیام۔ زندگی سے بھر پوچھیا، موت اور اس کی ہولناکیوں سے سے قطعاً نا آشنا شیام۔ — میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھ لی ہے۔ بالکل غلط ہے۔ — اخبار کا وجہ میرے دماغ کی اخراج ہے۔

آہستہ آہستہ لکھل کر دھنڈ دماغ تے ہٹنے لگی اور میں تمام داعیَ کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سُست نہ تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوپھار ہوا تو مجھے زبردست دھکانہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا ہے۔ اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے ہی پنج چکا تھا اب صرف اس کے آثار باقی تھے۔ صرف طبعہ رہ گیا تھا۔ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا۔

شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کہیں شام کی سکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی کہیں اُس کا پاؤ نکا قہر۔

پاگل خانے سے باہر فرزاناں کی دنیا میں پیشہ ہور تھا کہ سعادت حسن ٹو شام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بھے بہت انوس ہوتا۔ شام کی موت کی خبر سن کر مجھے زیادہ ہوشمند ہونا چاہیئے تھا۔ دنیا کی بے شباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں شدید ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا پھا ہیئے تھا۔ .... شام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو جانا محس پاگل پن تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہن اس تے  
سرگشته خار رسم دیقو د تھا  
رسم دیقو د کے بتوں کو تڑنے والے شام کی موت پر پاگل ہو جانا  
اس کی بہت بڑی توہین تھی۔

شام زندہ ہے اپنے دوپھول میں جو اس کی بے بوٹ محبت کا نتھی  
ہیں۔ تاجی (متاز) میں جو بقول اُس کے اس کی کمزوری تھی اور ان تمام  
عورتوں میں جن کی اور ڈھینوں کے آپخیل اُس کے محبت بھرے دل پر لگائے  
گا ہے سایہ کرتے رہے اور میرے دیں جو صرف اس لئے سو گوار ہے کہ  
کہ وہ اُس کی موت کے سرہانے یہ نفرہ بلند نہ کر سکا۔ ”شام زندہ باد“  
مجھے یقین ہے۔ موت کے ہونٹوں کو ڈے خلوص سے پوشنے ہوئے

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوا۔ ”مٹو۔۔۔ خدا کی قسم ان ہو نوں  
کامزہ کچھ اور ہی ہے۔“

شام عاشق تھا۔ عشق پیشہ نہیں تھا۔ دہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا  
تھا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ موت فرد رخوبصورت ہو گی، درد وہ کبھی نہ مرتا۔۔۔  
اُس کو تپش اور حدت سے پیار تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت کے  
ماਤھے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شام ٹھنڈے ہے ہمتوں کا بال قائل  
نہیں تھا۔ اگر دا قصی موت کے ماਤھے ٹھنڈے ہوتے ہوئے تو اس نے یہ کہہ کر  
ایک طرف جبک دیئے ہوتے۔ ”ہٹو بڑی بی۔۔۔ تم میں خلوص  
نہیں ہے؟“

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے:-

قصہ یہ ہے جان من ہا کہ زندگی خوب گذرا ہی ہے۔  
زندگی سے نوشی بے نوشی و زندگی با ساتھ ساتھ چل  
رہی ہے۔ تاجی (متاز) چھ چینے کے عرصے کے بعد اپس  
آگئی ہے۔ وہ ابھی تک میری ایک بڑی نبردست گزوی  
ہے۔ اور تم جانتے ہو عورت کی محبت کی راحت محسوس  
کرنا کتنی راحت انگریز چیز ہے!۔۔۔ آخر میں انسان ہوں  
ایک نور مل انسان۔۔۔  
نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی لمی ہے لیکن اول حق تھا۔۔۔  
کا ہے۔

## شاموں کو تمہاری "دانشمندانہ بکواس" اکثر یاد آتی

ہے۔

یہم ۲۹ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے :۔  
پیارے منٹو۔ اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تمہاری یہ  
خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں  
تمہارے دماغی تسلیل سے بخوبی واقف ہوں۔ میں  
غصہ سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم ملکخت  
چپ سا دھدیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی کوئی  
بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے  
اور وصول کرنا میں لطف حاصل ہوتا ہے جو ذرا "الگ  
قسم" کے ہوں ۔۔۔۔۔

منٹو! کسی سنتہ کہا ہے جب عاشق کے پاس نقطہ ختم ہو  
جائتے ہیں۔ تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب کسی  
مفرد کے پاس الفاظ کا ذیخرا ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ  
کھانے لگتا ہے۔ میں اس کہادت میں ایک اور چیز  
شامل کرتا ہوں۔ جب مرد کی مردانگی ختم ہو جاتی ہے  
تو وہ اپنے ماضی کو ملٹ کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن تم فرمائے  
نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دور ہوں۔ زندگی  
بہت مصروف اور بھر پور سہی۔ اور بھر پور زندگی

میں تم جانتے ہو۔ دیوانگی کے لئے بہت کم فرست ملتی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نیسم والافلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف محلہ ہو چکا ہے۔ امزناحتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں ذرا سوچو تو میری ہیرڈن کون ہے؟ — نگار — (نگار سلطان) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پردے پر اُن پرانے جذبات کا اعادہ کیے لگتا ہے۔ جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں مقلق رہے ہوں — پہلے مرتب تھی اب محض کار و بار لیکن کیا خیال ہے تمہارا۔ یہ سلسلہ جوش آفرین نہیں رہے گا۔

تابھی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی ابھی ہے۔ اور اُس کا سلوک بے عذر م و نازک پھلے چند دنوں سے رولا بھی یہاں مجھے میں موجود ہے اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے دل درماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر سکی۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی میر و تفریح رہی۔

اول لڈ بو اسے میں ان دونوں "فلریشن" کے فن میں  
ایڈ دانش ڈرینگ لے رہا ہوں۔ مگر درست یہ سارا  
سلسلہ بہت پچیدہ ہو گیا ہے۔ بہر حال میں پچیدہ گیاں  
پند کرتا ہوں۔

دہ میرے اندر جو قسمت آزمائیم جو اور آدارہ  
گرد ہے ابھی تک کافی طاقتور ہے۔ میں کسی شخص  
جلگہ کا نہیں۔ اور نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں  
میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ اور ان سے نفرت  
کرتا ہوں۔ زندگی یوں ہی گذر رہی ہے۔ دراصل زندگی  
ہی ایک عشق وہ ہے جس سے مجھے محبت ہے اور گہائیں  
بہنم ہیں۔

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہے۔ مگر اس کا ایک جملہ  
یاد رہ گیا ہے۔ شاید دہ بھی درست نہ ہو۔ مگر انہیں  
کچھ راسی قسم کا تھا..... دہ لوگوں سے اس قدر  
محبت کرتا تھا کہ (خود کو محبت کرنے میں) کبھی تنہا محسوس  
نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر ان سے نفرت کرتا  
تھا (نفرت کرنے میں خود کو) یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا۔  
میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں سرسکتا۔

ان دو خطوں میں تابجی کا ذکر گیا ہے۔ خطوط دو حصہ اتنی میں اتنا تو

میں بتا چکا ہوں۔ کہ یہ ممتاز کی تصفیر ہے۔ ممتاز کون ہے۔ یہ خود شام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ چج پوچھئے تو نگار۔ رولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور بھی اس کے کردار کا مفہوم طریقہ پہلو تھا۔

متاز، زیب قریشی ایم اے کی چھوٹی ہیں ہے۔ زیب کے ساتھ یہ گئی۔ تو وہاں ظہور راجہ کے بھاری بھر کم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ حصہ کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لا ہو ر آئی۔ تو شام کے ساتھ رد مانش شروع ہو گیا۔ بیبے میں جب شام کی مالی حالت درست ہوئی تو اس نے اپنے ہونے والے پتوں کی خاطر اُس سے شادی کر لی۔

شام کو پتوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت پتوں سے خواہ وہ حد درجہ بد تیزی کیوں نہ ہوں۔ ٹھہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بد تیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بد تیزیوں کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پردہ تھا۔ اس نے بھی ان عورتوں کی خوشبوتوی کے لئے اپنی عادات سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ”منشو بے میری باتیں من کریں ناک بھوں چڑھانے والی سایساں سب نہیں... میک اپ کی دنیا میں ربی ہیں؟“

لیکن بعض عورتیں اس کی بد تیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں کیونکہ ان میں بستر کی بوناں ہوتی تھی۔ شام ان سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی

اُس سے ایسی باتیں کرتیں جو مذہب سوبائیٹ میں قابلِ ستر پوش سمجھی جاتی ہیں . . . . ۔ ہونٹوں پر مسکرا ہیں ناچھتیں ۔ ٹلنے سے تھہرے اُنچھلے بہنچتے ہنچتے شام کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دو رکونے میں طہارت پسندی نوکیلے کیلوں پر آسن جائے اپنے سکناہ بخشوانے کی رائی کان کو شش سحر جی ہے ۔

شام سے ہیری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے بالکل یاد نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا ویسے اب سوچتا ہوں تو آتیا یاد آتا ہے ۔ کہ بمعینی میں اُس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید یہ ڈی جمیش بھی رد ڈپر ہوئی تھیں ۔ جہاں میری بہن رہتی تھی ۔ ”ہائی نسٹ“ میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈا ٹانڈر رہتی تھی اُس کے ہاں شام کا آنا جانا تھا ۔ در تین مرتبہ غالباً سیر ٹھیوں میں اس سے ملنا ہوا ۔ یہ ملاقاتیں گور سکی تھیں ۔ لیکن پھر بھی غایت درجہ بنتے تکلف تھیں ۔ کیونکہ شام نے مجھے خود ہی تبا دیا تھا کہ ڈا ٹانڈر نام کی عورت جو منزل شیام کہلاتی ہے ۔ درحقیقت اُس کی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بناء پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے ۔ وہ ازدواجی رشتے اور اُس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا لیکن جب ایک تکالف کے سلسلہ میں اُس کو ڈا ٹانڈر کو ہسپتال واخل کرنا پڑا ۔ تو اُس نے رجسٹر میں اُس کا نام منزشیام ہی لکھوا یا ۔

بہت دیر بعد ڈا ٹانڈر کے شوہر نے مقدمے بازی کی ۔ شام کو بھی

اس میں پہنایا گیا۔ لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ڈالمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ پکی تھی۔ اور روزی جیسیں رکھ پکی تھی۔ شام کی زندگی سے نکل گئی بگر شام اُس کو اکثر یاد کرتا تھا۔

مجھے یار ہے۔ پُونے کے ایک باغ میں اُس نے مجھے سیر کرتے ہوئے کہا۔ ”مٹو ۔ ڈالمنڈ کریٹ عورت تھی ۔ خدا کی قسم جو عورت استھان پر داشت کر سکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے؛“ لیکن فوراً ہی اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”یہ کیا بات ہے مٹو ۔ عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے۔۔۔ کیا اُس کے لئے یہ گناہ کا ہوتا ہے؟ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ جملی یا اصلی ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ حرام کا یا ملال کا نہیں ہو سکتا وہ جبکہ یا کہ پڑھ کے چھری پھیرنے سے پیدا ہیں ہوتا۔ اُس کی پیدائش کا موجب تو وہ عظیم اشان دیوانگی ہے۔ جس کے مریض سب سے پہلے باداً اُدم اور اُماں خواہوتے تھے۔ آہ، یہ دیوانگی۔“ اور وہ دیر تک مختلف دیوانگوں کی باتیں سر تارہ۔

شام بہت بلند بانگ تھا۔ اُس کی ہربات، اُس کی ہر حرکت، اس کی ہر ادا اور پنج سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قابلِ تھا میں سمجھدگی و متنات کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اُس کے نزدیک سخرہ پن تھا۔ مغل سے نوشی کے دوران میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا تو اُسے ناقابلِ بیان کوفت ہوتی۔ اُس قدر بمحضلا جاتا کہ بعفر و قما

بول اور گلاس توڑ پھوڑ کر چالیاں دیتا مغل سے باہر چلا جاتا۔

پونے کا ایک واقعہ ہے۔ شیام اور مسعود پر ویز دنوں ”زبیدہ کائن“ میں رہتے تھے۔ ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلہ میں مجھے ہاں لیھرنا پڑا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے رم کا ذور شروع ہوا۔ اس دوران میں بھائی آئے اور بہک کر چلے گئے؛ میں اسود اور شیام ٹھٹھے ہوئے تھے۔ شیام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور پھانما رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اُس کو دفترہ محسوس ہوا کہ مسعود دن کی تمام ہار ہوئے الگ تھلک رہا ہے۔ نشے سے پورا آنکھوں کو سیکھ ڈسکر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا۔ اور ہنریہ بھجے میں کہا۔ لیکیوں حضرت پر ویز —  
کیا آپ نے اپنا مرثیہ مسئلہ فرمایا ہے؟“

مسعود حسب عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آگیا۔ اور شیام مسعود کی مسجد مسکراہٹ کے پریمہ اکر دہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دور چلتے تو شیام نے کرشن سے مسعود کے ”ناقابلِ برداشت انعام“ کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا اکھونے کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اُس نے لعن طعن شروع کر دی۔ ”تم کیسے شاعر ہو پر ویز — صبح سے پی رہے ہو کوئی دامیات بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر دامیات بجو اس کرنا نہیں جانتا۔ وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے چرتہ ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے تمہاری یہ شاعری یقیناً بکوام ہو گی۔“

اور تھارا پی کر یوں کیسٹر آئیں کی بول بن جانا تھاری اصل شاعری ہے۔  
یعنی کہ شام اس قدر ہنسا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے  
لگے۔

جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیر جاری رہی تو وہ اُس کا۔ اُنھوں کا  
نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیئے اور کہا۔ ”چلو باہر چلیں۔“  
ہم باہر نکلے۔ مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اُتار کر جیبوں  
میں رکھ لئے۔ اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔  
پونہ کی طریق سب سنان تھیں۔ میں مسعود، شام اور ایک اور جس کا نام  
مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ دار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب  
اپنی منزل سے نا آشنا۔

رات سے بیس کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے  
الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلوا کہ ہم نے اُسے بہت پریشان کیا۔  
اس کی تینیں خاتون ہمارا شور من کر دوسرے کرے سے باہر نکل آئیں اس  
سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ جس کے پیش نظر ہم اُس سے خخت  
ہوئے اور پھر سڑک پہنچائی تشردی کر دی۔

اسی طرح تین نج گئے۔ ایک سڑک میں کھڑے ہو کر مسعود  
نے وہ مغلظات کیں کہ میں ذنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں  
نے سمجھنی نا شائستہ کلمہ نہیں سناتھا۔ مگر جب وہ موٹی موٹی گایاں اُنکی  
رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی زبان پر تھیک طور پر سمجھتی نہیں

نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زیدہ کائی پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگنا رہا اور شعر کہتا رہا تھا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ مکمل کھینچنے کا قابل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی دستت روکنے لیتا تھا۔ اُس کی بیانی چور ڈائی کو اپنی طرح جا پہنچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ”میں چو کے پسند کرنا ہوں... چھکے محض انفاق سے لگ جاتے ہیں：“  
ایک چھکا ملا حظہ ہو۔

تقصیم ہونے سے پہلے ماہ پیشتر کا ذکر ہے۔ — شام، شاہدِ طیف کے گھر سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بیسوی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے۔ مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک دن شام ہاتوں باتوں میں زیادہ پی گئے۔ راجہ ہندی ٹلی خان بھی انفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا تو اُس نے چانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”پاگل ہونے ہو پکڑے جاؤ گے۔“  
شام نے اُس سے ازراہ مذاق کہا۔ ”میں سو جاؤ۔ آج کل تابی یہاں نہیں ہے۔“

راجہ نے سکر اکر جواب دیا۔ ”مجھے یہند نہیں آئے گی پسزگ دا لے پنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔“

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برائی کا پک ڈالا اور اس کو دے دیا۔ ”یہ لو۔ اس سے نیند آ جائے گی۔“ راجہ ایک جرسے میں سارا گلاس چڑھا کیا۔ بہت دیر تک تاجی کی پاتیں ہوتی رہیں۔ جو شیام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چل گئی تھی ہر آٹھویں دسویں روز نکتہ نکتہ با توں پرچھ نہ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شیام کو یہ بالکل پند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گوراولی ہی دل میں یہ معافیہ ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل انداز نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے لمبی داپس نہیں آئے گی اور شیام نے بھی اُسے یوں دفاع کیا تھا جیسے وہ پھر بھی اس کی تسلیم کے دیکھنے کا ردادر نہیں ہو گا۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے درجیئے تڑپے رہتے تھے نہاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاشرے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ نیں سوچنا تھا کہ وہ ضرور رات بھروس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم جتنے نہ کچھ ایسا ماما تھا کہ پنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے قلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا کمرہ دوسرا بیٹھنے کا۔ سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گذا بھاکر میں سو تما تھا۔ تاجی پونکہ موجود نہیں تھی۔ ان لئے اُس کا پنگ راجہ ہدی علی خاں کو مل گیا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی بیپنی جگہ پر سو گئے۔

حسب معمول پونے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا۔ کہ میرے ساتھ کوئی یٹھلے ہے۔ پہلے میں نے خجال کیا کہ یہ ہو یہ ہے۔ مگر دہ تو لاہور بھی تھی۔ آنکھیں کھول کر رکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا؟ الجھی یہ سوچ، ہی رہا تھا کہ جلد ہوئے پڑے کی بُوناک میں لھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگریٹ گرنے سے اس کا ایک حصہ جل گیا تھا مگر آئی دیر کے بعد اب بُو آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں۔ تو میں نے دھوئیں کی کرڑا ہٹ محسوس کی۔ اور بلکہ دودھیا بارل بھی دیکھے۔ آٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جس پنگ پر شام سویا کرتا تھا۔ سُلک رہا تھا۔ اور پاس ہی دوسرے پنگ پر راجہ جہدی ٹلی خال اپنی تونڈ نکالے پڑا خرا۔ لے لے رہا ہے۔

میں نے قریب چاکر پنگ کے جلد ہوئے حصہ کا معانیہ کیا ہیڑسیں بڑی رکابی کے پر ابر سوراخ تھا جس میں۔ سے دھوان نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجانا کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پنگ پانی میں ترپت تھا۔ مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریلی کے پھوس کا تھا۔ اس لئے آگ بھی نہیں تھی اور پر ابر سُلک رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جھانے کی کوشش کی مگر دہ کر دٹ بدل کر اور زور سے خڑائے لینے لگا۔ ایک دم پنگ کے پیاہ سوراخ سے ایک لال لال شعلہ باہر پکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بجا گا۔ ایک بالٹی پانی اس سوراخ میں ڈالی۔

اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ بخوبی۔ تو راجہ کو جھنجور جھنجور کر جگایا۔ اُس سے جب آتشزدگی کی داردات کے متعلق استفسار کیا تو اُس نے اپنے مخصوص مزاچہ انداز میں خوب نک مرپ لکا کر دادعات بیان کئے۔ ”تھا را یہ شیام رات برانڈی کے مالاب میں غوطہ لکاتے ہوئے سو گیا۔ وہ بے کے فریب جب عجیب عجیب آوازیں ہمیں تو میں جاگ پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام پنگ پر زور زور سے اچھل کو د رہا ہے اور آگ لگا رہا ہے۔ جب آگ لگ گئی۔ تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور برانڈی کے مالاب میں غوطہ لکا گیا۔ تھہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی دالا تھا کہ مجھے تھا را خال آیا۔ کہ غریب آدمی کا پنگ ایسا نہ ہ کہ جل کر را کھہ ہو جائے۔ چنانچہ اٹھا۔ شیام غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں تھیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا۔ تو یہ دیکھتا ہوں کہ شیام نہ کھل کے ساتھ چھٹ کر لیٹا ہے۔ میں نے تھیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے چینہ پر زور لکا کر تھیں پکارا۔ گھٹے بجائے۔ ایم بم چلاۓ۔ مگر تم نہ اٹھئے آخر میں نے ہوئے ہوئے تھا رے کان میں کہا۔ خواجہ اٹھو۔ اسکا پوسکی کی ایک پوری بیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور پوچھا کہاں شے میں نے کہا ”ہوش میں آؤ۔ سارا مکان جل رہا ہے... آگ لگ گئی ہے۔“ تم نے کہا ”جگتے ہو“ میں نے کہا ”ہمیں خواجہ۔ میں خواجہ خفر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے۔“ جب تھیں میرے بیان پر قہقہ آگیا۔ تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے۔ ”فارم بر بیگد کو اطلاع دیدو۔“

تھاری طرف سے یا یوس ہو کر میں نے شیام کو حالات کی نزاکت سے آنکھ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اُس کے دماغ تک پہنچ سکے۔ تو اُس نے مجھ سے کہا۔ ”تم بمحادونہ یا ر۔۔۔ یکوں تنگ کرنے ہوتا اور سو گیا۔۔۔ آگ آخڑاگ ہے۔ اور اس کا بھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً اپنی ساری انسانیت مجتمع سر کے فائز بریگیڈین گیا۔ اور وہ جگ جو میں نے تھاری سالکرہ پر تخفیف کے طور پر دیا تھا۔ بھر کے آگ پر ڈال دیا۔۔۔ میرا کام پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا۔

شیام جب پوری نیند سو کر اٹھا۔ تو میں نے اور راجہ نے اُس سے پوچھا کہ آگ کیسے لگی تھی۔ شیام کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیرے عذر و فکر کے بعد اُس نے کہا۔ ”میں آتشزدگی کی اس دار دامت پر کوئی رد شنی نہیں ڈال سکتا۔“ مگر جب راجہ دوسرے کرے سے شیام کی جلی ہوئی تیپڑا ٹھا کر لایا۔ تو شیام نے مجھ سے کہا۔ ”اب تفتیش کرنی ہی پڑے گی۔“

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ شیام صاحب نے جو نیا ان پہنچا دادہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گھرائیوں میں کئے تو دیکھا کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے بچتے دوڑتے آیتے ہیں۔ چنانچہ شرک ہومز نے اپنے دوست داں سے کہا۔ ”یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو ہانچھ پکی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمارے راجہ ہندی جلی خان کو تخلیف نہ ہو چپ چاپ اٹھکر

میرے پاس چلا آیا۔“

جب شیام نے تہذیب و تمدن کے مروجہ تو این کے پیش نظر تماجی سے باقاعدہ شادی کی تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک انتقامی جنہیے کے تحت اُس نے اتنی شامدار دعوت کی کہ دیر تک فلمی دنیا میں اس کے چرچے رہے۔ اتنی مٹراب بہانی لگی کہ خم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کے تہذیب و تمدن کی سترپوش چولی کے داع غوصل نہ سکے۔

شیام صرف بوئل اور عورت کار سیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجودیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اپھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اپھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مگر اُس کو اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی تھی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اُس کی کسلی جان تھی۔ جو اتنے بڑے کرنے کی دریکھ بھال کرتی تھی ایک عرصے تک وہ انہی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی غنیمتیں۔ مگر وہ ہستارا۔ ”جانِ من ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو میری بغل میں ہو گی۔“ اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آہی گیا کہ دولت اور شہرت دونوں اُس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمد نی ہزاروں روپے ماہوار ملتی۔ بیہے کے

مضافات میں لا یک خوبصورت بیگلہ اُس کی ملکیت تھا۔ اور کبھی وہ دن نہ تھے کہ اُس کے پاس سرچھپا نے کو جگہ نہیں تھی مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہ ہستا ہوا شام تھا۔ دولت اور ثہرت آئی تو اُس نے اُس کا یوں استعمال نہ کیا۔ جس طرح لوگ ڈپی کشنر کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترماں اس کے پاس آئیں۔ تو اس نے ان کو اپنی بوہے کی چار پائی پر بھالیا۔ اور پیا خ۔ پیا خ بوہے داغ دیئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے۔ تو دونوں کی لات پہلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی یادیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دوہرے گذر رہی تھی۔ میں بہبیٹا کیز میں ملازم تھا۔ اُس کا وہاں ایک پکر کا نزک تھا دس ہزار روپے میں۔ عرصہ کی بیکاری کے بعد اُس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پہنچنے نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طور پر ہو جاتا تھا۔ میاں یوں ہوتے تو ان میں روپے پہنچنے کے معاملے میں ضرور پچ ہوتی۔ ملکشیاں اور مجھے کبھی محسوس نہ ہوا۔ کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے اور کتنا کمرہ رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی۔ ر غالباً پانچ سور روپے تھے) میری جیب خالی تھی ہم ملادے کے گھر آ رہے تھے۔ راستے میں شام کا یہ پروگرام بن گیا کہ وہ چرچ کیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا ایشن آیا تو اُس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ آنکھیں بند کر کے اُس کے دو حصتے کئے اور مجھ سے کہا۔

"جلدی کروں نہو... ان میں سے ایک لے لو۔"

میں نے گڈائی کا ایک حصہ پڑھ کر جیب میں ڈال لیا اور پلیٹ فارم پر اٹر گیا۔ شیام نے مجھے "ٹاما" کہا۔ اور کچھ غورٹ جیب سے نکال کر لہراتے "تم بھی کیا یاد رکھو گے۔ بیسفٹ کی خاطر میں نے یہ توٹ علیحدہ رکھ لئے تھے۔  
— ہپ ٹلا!

شام کو جب وہ اپنے دوسرا ٹھیکانہ مل کر آیا۔ تو وہ کہاں ہو رہا تھا۔ مشہورلم اشارہ کے سے "نے اس کو بلا یا تھا کہ وہ اس سے ایک پیدائشی بات کرنا پڑا، تھی ہے۔ شیام نے برانڈ میکی بولیں بغل میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر مجھ سے کہا۔ "پرے ایوٹ بات یہ تھی....  
میں پنے لا ہو رہیں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا" کے سے کہ "مجھ پر مر قی ہے۔ خدا کی قسم بہت بڑی طرح مر قی ہتھی۔ لیکن اُن دنوں میرے دل میں کچھ گنجائش نہیں ہتھی۔ آج مجھے اپنے گھر ملا کر کہا کہ تم نے کوئا اس کی تھی۔ میں تم پر بھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ میگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مجھے غصہ میں آکر اُس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ایک عورت پر لاتھا اٹھایا۔"

شیام نے مجھے اپنا لاتھ دکھایا۔ بوزخی ہو رہا تھا۔ "کم بنت آگے ہٹ گئی۔ نثارہ چوکا۔ اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جاٹھرا یا۔"

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔ "سالی بیکار تنگ کر رہی ہے؟"

میں نے اور پر روپے پیسے کا ذکر کیا ہے — غالبًاً دوسرے پچھے

کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوب حالی اور اپنے افانے "ٹھڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالت ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین ہفتے قید با مشقت اور تین سور و پے جرمانہ۔ کی سزا دی تھی میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک دوں اور کوئی کام شروع کر دوں جس کا تخلیق کے کوئی ملا قدم نہ ہو۔ پنجگی کے نکلے ہیں ملازم ہو جاؤں اور رثوت کھا کر اپنا اور اپنے پتوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ پیش کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک غریب دوستے میرا دل دو ماہ گزر لے گئے تھے۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے نے لکھ کر ان پر مقدمے پڑھوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں گے۔ سنتی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے سفلی چڑھاتے مختتم میں کہاں کو پیدا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے پہنچ چکے ہیں۔ ان چار انوکھے کو پیدا کرنے میں جو خم میری گھر میں پیدا ہوا اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے بھی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے جب تکما سرد یا تو آمدی کے محمد دوز رائے اور بھی سکرٹ گئے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و گتابت نہ تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اچھا ٹھہرے چکا تھا اکثر کھرے سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا۔ جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اُن کی صحبت

بیں رہ گریں جبمانی درود حافی خود کشی کی کوشش میں معروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تھیں پچھر ز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فوراً ملوں۔ بجے سے اُنھیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم سرنے کے لئے کہیہ ہدایت بھیجنے والا کون ہے۔ میں تھیں پچھر ز والوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ بجئے سے شام کے پتے درپے اُنھیں کئی تاریخ ہیں کہ مجھے دھونڈ کر ۵ روپے دے دیئے جائیں۔ میں جب دفتر پہنچا۔ تو وہ شام کے تازہ تاکیدی تارکا جواب لکھ رہے تھے کہ تلاش بیمار کے بعد انہیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵ روپے ملے لئے اور میری مخواہ نکھوں میں آنسو آگئے میں نے بہت کوشش کی کہ شام کو خط لکھ کر اُس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰۰/- روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اُس کو معلوم تھا کہ میری مالی حالت کمزد ہے اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھر اُس دیئے۔ ایسا محسوس ہوا تھا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شام کے اُس جذبہ کا منہ پڑھا رہے ہیں۔ جس کے زیراثر اُس نے مجھے یہ روپے ردانہ کئے تھے۔

پہلے سال جب شام اپنی ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلہ میں امر تسریا تو تھوڑی دیر سکتے لاہور بھی آگیا یہاں اُس نے بہت سے لوگوں سے میرا آتا پا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے بھی معلوم ہو گیا کہ وہ لاہور میں موجود

ہے۔ میں اُسی وقت دوڑا اُس سینما جا پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھلکھلے آ رہا تھا۔

میرے صاحبھر شید عطرے تھا۔ شیام کا پونے کا پُرانا دوست جب موڑ سینما کے صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے بھے اور شید کو رکھ لیا۔ ایک زور کافرہ اُس نے بلند کیا۔ اُس نے ڈرائیور سے موڑ رکھنے کے لئے بہت کہا۔ مگر اُس کے استقبال کے لئے اس قدر جوم تھا۔ کہ ڈرائیور نہ رُکا۔ موڑ سے نکل کر پلیس کی مدد سے شیام اور ادم ایک ہی قسم کا باس اور سر پر سیند پانامہ پیٹ پہنچنما کے اندر پچھلے در دازے سے داخل ہوئے بڑے در دانے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام۔ وہی شیام تھا۔ مُسکرا آہنتا اور قہقہے لگانا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے پیٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اور پتلتے آتی باتیں ہوئیں کہ اب تاریگ گئے اور ہم اس میں دب کر رہ گئے۔ سینما سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری یوکر سے دفتر میں جانا تھا، ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوئی فواؤک جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ پہنچے بازار میں ہجوم شور پر پا کر رہا تھا کہ شیام درشن دینے کے لئے باہر بیٹھنی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اُس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد ڈسٹرکٹوں پر اُس کے رہمانوں

کے چینیٹے بھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرتسرے ہزاروں میل ہو گیا تھا۔ اور اس کا رادیپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے راپکن کے دن گزارے تھے؟ لاہور امرت سرادر رادیپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر لئے مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شام یہاں پھوڑ مر گیا تھا۔ بیاست کے گورکن نے انہیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا۔

شام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ رہو مگر اُس کے دل درماش کی منظر بیفت کے احساس نے مجھے سخت پر انذہ کر دیا۔ اُس سے یہ وغدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوشی میں ملوں کا چلا گیا۔

شام کے اتفاق دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ محرخوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھنی گھنی کونت محسوس ہو رہی تھی۔ بیعت میں اس قدھنجلاء تھی کہ جی چاہتا تھا کسی سے زبردست رہاں ہو جائے۔ خوب مارکٹانی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ بھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے سارے دھانے بڑی طرح آپس میں منجھ گئے اس سے بیعت اور بھی جھنجلائی اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پہنیا شروع کر دی۔

نو سارے نو کے قریب شور سنبھلے پر معلوم ہوا کہ شام آگیا ہے اُس پر کمرے میں ملنے والوں کی زندگی ہی بھیر دیتی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا مگر کھل کر بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لکھا کر چاپیاں کیے نے ایک بہت بڑے پھٹے میں پروردی

ہم دونوں اس سچھے میں سے ایک ایک چاپی نگال کریتا لے کھونے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں آستانا گیا۔ ڈر ز کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی۔ لگر میں نے اس کا ایک نظر تک نہ سننا۔ میرا اپناد ماغ بڑے اوپکے سروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکو اس ختم کی۔ تو ووگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تایاں پیٹیں۔ میرا ڈھکر کرے میں چلا۔ دہان فضلی پیٹھے ہتھے۔ ان سے ایک ہمروں بات پر پچھ ہوئی۔ شیام آیا تو اُس نے کہا۔ ”یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں۔ چلو آدم تم بھی چلو۔“

میں قریب قریب رو دیا۔ ”میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔“

”تو میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گایاں دیا اور فضلی سے کہا۔ میرا خیال ہے آپ تو یہاں انتظار کریں گے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو اور اہ کرم اپنی موڑ میں جسچے میرے گھر تک چھوڑ آئیے۔“

رات بھرا اور پٹاگ ک خواب دیکھا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی۔ صبح دودھ والا آیا۔ تو میں کھو کھلے غصہ میں اُس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم باہل بدلتے ہو۔۔۔۔۔ اُتوں کے پتھے۔ کینے، ذیل۔۔۔۔۔ تم بند دبو۔۔۔۔۔ نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی

نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اپنی طرح ٹوٹا تو یقین ہو گیا کہ میرا منہ  
نہیں تھا۔ یہ سات کا بھونپو تھا جس سے یہ گاہی تکلی ملتی۔ اس کے متعلق سچے  
ہوئے میں نے دُدھ دالے سے دودھ ہے۔ جس میں ایک چورخانی پانی تھا  
اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی کہ شام ہندو تھا۔ مگر پانی ملا ہندو  
نہیں تھا۔

عرضہ ہوا جب تھیم پر ہندو مسلمانوں میں خوزیر جنگ جاری تھی اور  
طرفین سے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے۔ شام اور میں راولپنڈی  
سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اُس کے  
افراد اپنے تازہ زخموں کی رواداد سنارہے تھے۔ جو بہت ہی دردناک تھی۔  
شام متأثر ہوئے بغیرہ رہ سکا۔ وہ بچل جو اُس کے دماغ میں پہنچ رہی تھی۔  
اس کو میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم دہل سے رخت ہوئے۔ تو میں نے  
شام سے کہا ”میں مسلمان ہوں، میا تھارا جی ہنیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔“  
شام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس وقت نہیں۔  
لیکن اس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے دعاۓ ہوئے منظالم کی داستان سن رہا  
تھا تھیں قتل کر سکتا تھا۔“

شام کے سخنے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکانگا۔ اس  
وقت شاید میں بھی اُسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اُس وقت  
..... میں زمین دہمان کا فرق محسوس کیا تو ان فسادات کا نفیا تو پس نظر  
میری سمجھ میں آگیا جس میں روزانہ سینگڑاوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت

کے گھاٹ آتار سے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں... اُس وقت ہاں... کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کیوں کے پیچے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

بینی میں بھی فرقہ دارانہ کیشیدگی دن بدن بڑھتی رہی جا رہی تھی۔ بیٹے ٹائیز کی عنان حکومت جب اشوك اور وآچا نے سنبھالی تو بڑے بڑے ٹھہرے اتفاق سے سمازوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس سے بیٹے ٹائیز کے ہندو اٹاف میں نفرت اور غصہ کی ہر دورگی۔ وآچا کو گمام خذموصول ہونے لئے جس میں اسٹڈیو کو آگ لگانے اور مرلنے مارنے کی رہنمیکار ہوتی تھیں۔ اشوك اور وآچا روزوں کو اس کی کچھ پردا نہیں تھی لیکن کچھ ذکری الحسن ہونے کے باعث اور کچھ ممان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی زراکت کو بہت زیاد اہمیت دے رہا تھا۔ کبھی مرتبہ میں نے اشوك اور وآچا سے اپنی تشویش کا انہمار کیا اور ان کو رائے دی کہ وہ مجھے بیٹے ٹائیز سے الگ کر دیں کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان والوں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ یوں بچے پاکستان میں تھے جب وہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ تو میں اُسے جانتا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو گسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں اُن سے بھی واقف تھا۔ مگر اس خط نہیں کو نئے نامہ نے کیا بنادیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

۱۲، اگست کا دن میرے سامنے بیجیں منایا گیا۔ پاکستان اور  
ہندوستان دونوں ملک آزاد قرار دینے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور  
تھے مگر قتل اور اگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ  
باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے فرعے بھی لگتے تھے۔ کانگریس  
کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لبرتا تھا۔ پیڈٹ جواہر لال نہرو اور  
فائدہ اعظم محمد علی جناح دونوں کے فرعے بازاروں میں گونجتے تھے۔ سمجھ  
میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا دن ہے یا پاکستان اور وہ ہو کس سکا  
ہے جو ہر روز اتنی بیداری سے بہایا جائے ہے۔ وہ ڈیاں کہاں جلانی  
جائیں گی یادوں کی جائیں گی جن پر سے نہ ہب کا گوشت پوست ۱۰ چلیں اور  
گدھ نوچ نوچ کر کھلے گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام  
کون ہو گا۔ جب غلام لختے تو آزادی کا تصور کر سکتے تھے۔ اب  
آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد  
بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔

ہندو اور مسلمان دھڑکا دھڑک مرد ہے تھے۔ کیسے مرد ہے  
تھے، کیوں مرد ہے تھے۔ ان سوالوں کا جواب مختلف تھا۔ ہندو تھا  
جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا۔  
مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی  
جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کر دے کوئی  
کہتا۔ نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے پڑ

کر اُسے غلبہ خاندان کی تاریخ میں ٹوٹنے کے لئے کہتا۔ سب پیچے ہی پیچے بہتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور ہو اور ہو ہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن انسان مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصیب کا غلام.... نہ ہی جو کا غلام۔ جموں اینست و بربیت کا غلام۔

میں نے بے ٹائیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوك اور داچا آتے۔ تو میں خلائق طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ شیام مجھے رکھتا اور مُسکرا دیتا۔ اُس کو میری قلبی کیفیت کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم ٹسم پڑا رہتا سو فے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام اٹڈیو سے آیا تو اس نے مجھے لیا دیکھ کر مزاجہ انداز میں کہا۔ ”کیوں خواجہ جنگالی کر رہے ہو؟“

مجھے بہت بھجنگلا ہٹ بوتی تھی کہ شیام میری طرح کیوں نہیں ہوتا۔ اُس کے دل دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں۔ جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مُسکراتا رہتا اور شور پھاتا۔ مگر شاید وہ اس نتھے پر چونچ چکا تھا کہ جو فضا اُس دقت گردش پر تھی۔ اس میں سوچنا بیکار تھا۔

میں نے بہت غور کر کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ اُکر میں تھے۔

کہا۔ ہٹاؤ چلیں یہاں سے ۔۔۔ شام کی ناٹ شومنگ نہیں۔ میں نے اپنا اسباب دیگرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گذرگئی صحیح ہوئی تو شام شومنگ سے فارغ ہو کر آیا۔ اُس نے میرا بندھا ہوا اسbab دیکھا تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ ”چلے؟“

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا ”ہاں“

اس کے بعد میرے اور اُس کے درمیان ہجرت کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ تھا یا سامان رکھوانے میں اُس نے میرا ہاتھ ڈبایا۔ اس دوران میں رات کی شومنگ کے لیے بیان کرنا رہا اور خوب ہنستا رہا جب میرے دانہ ہونے کا وقت آیا۔ تو اُس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے۔ اور ایک مجھے دیا۔

شام نے ہتھ لکاتے ہوئے مجھے اپنے چورڑے سینے کے ساتھ بخیج یا۔۔۔ سورہ کیس کے؟“

میں نے اپنے آنسو روکے ”پاکستان کے“

شام نے پر خلوص نفرہ بلند کیا ”زندہ باد پاکستان“۔

”زندہ باد ہندستان“ اور میں یقین پہنچا گیا۔ جہاں تک دالا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بند رگاہ تک شام میرے ساتھ گیا۔ جہاں پہنچنے میں کافی دیر ہتھی۔ دھ ار صر اور صر کے لیے سنائیں کہ میرا دل بھلاتا رہا۔ جب دسل ہوا تو اُسی سے میرا ہاتھ دبا یا۔ اور ”گینگوے“ سے یقین اُتھ گیا۔۔۔ مرٹر کر

اُس نے میری طرف نہ دیکھا اور مجبو طبقہم اُنھا تا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اُس کو خط لکھا۔ ایس ایک اڑاکیں کو اُس کا جواب آیا:-

”پہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں تمہاری اور تمہاری بذلمہ بھنگی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں جو تم بڑی فراہدی سے اُن پر ضائع کرتے تھے۔ وآچا ابھی تک اس بات پر مضر ہے کہ تم کہنی کرتے گے اب کی دفعہ اس کو اطلاع دئے بغیر پاکستان بھاگ کر۔ عجیب تناقض بات ہے کہ وہ جو بیٹے ڈاکیزیت سمازوں کے داخلے کی مخالفت میں سب تے آگئے تھا، سب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا۔ خود کو اپنے نظریے کا شکار بناتے ہونے یہ وآچا کا اپنا نظریہ ہے مجھے امید ہے کہ تم نے اُس کو ضرور خط لکھا ہو گا۔ اگر نہیں لکھا۔ تو فوراً لکھو کم از کم شرافت کا بھی تقاضا ہے۔“

## تھار اشیام



# دیل صاحب

(دی، ایچ ڈیسائی) :-

“لامس اون... . فین اوف... . کیمرہ ریڈی - شارٹ میر  
جگتا پا! ”  
“شارٹ! ”  
“میں تھرٹی فور... . ٹیکٹن! ”  
“میلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشایاب  
پیا ہے! ”  
“کٹ سٹ! ”

لامس اون ہوتی۔ دی ایچ ڈیسائی نے رانفل ایک طرف  
رسکتے ہوئے بڑے... . . . . . اشوک سے  
پلٹر چھا۔ ”او“ کے مسر ڈیگنگولی ”

اشوک نے جو جل بھین کر راکھ ہونے کے قریب تھا قہر آلو زنگا ہوں

سے خلائیں دیکھا اور زہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کر  
چہرے پر مصنوعی خوشی کا انہصار کرتے ہوئے ڈیساٹی سے کہا۔ ”ونڈر فل“  
پھر اُس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں منٹو ہے؟“  
میں نے ڈیساٹی کو لگائیا۔ ”ونڈر فل“

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی بنسی کا بہت بڑی طرح گلا گھونٹ  
رہے تھے۔ ڈیساٹی بہت خوش تھا۔ چونکہ اُس نے بہت دیر کے بعد میرے  
منہ سے اپنی اس قدر پروش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ  
پہلے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اپنی بھجنہلا ہٹ کا انہصار ہرگز ہرگز نہ کر دیں  
کیوں کہ آئے اندیشہ تھا کہ ڈیساٹی بو کھلا جائے گا اور سارا دون غارت  
کر دے گا۔

جب چند لمحات گزر گئے تو ڈیساٹی نے مکالمہ آموز ڈکٹٹ سے کہا  
”ڈکٹٹ صاحب نجٹ ڈائیلاگ؟“

یہ سن کر اشوک جو کہ ”آٹھ دن“ نامی فلم ڈائرکٹ کر رہا تھا، مجھ  
سے مخاطب ہوا۔ ”میو، میرا خیال ہے پہلا ڈائیلاگ ایک دفعہ اور یہ  
لیں۔“

میں نے ڈیساٹی کی طرف دیکھا۔ ”کیوں ڈیساٹی صاحب؟“  
میرا خیال ہے اس دفعہ اور بھی ونڈر فل ہو جائے۔“

ڈیساٹی نے بھرا تی انداز میں اپنا سر ہلا کیا۔ ”ہو... تو یہ لو بھی  
گرما گرم معاملہ ہے؟“

رنارام چلایا۔ "لامٹس اون۔" لامٹس روشن ہوئیں۔ ڈیسائر نے رانفل سنبھالی۔

ڈکٹ جٹ سے ڈیسائر کی طرف پکا اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے لگا۔ "مرٹر ڈیسائر۔ ذرا دہ رائیلگ یاد کر لیجئے۔"

ڈیسائر نے پوچھا۔ "کون سا ٹرائیک؟"

ڈکٹ نے کہا۔ "دہی جو آپ نے اتنا ذرفل بولا تھا۔ ذرا اُسے دہرا دیجئے ۔"

ڈیسائر نے بڑے شکن اعتماد سے کندھے پر رانفل چلاتے ہوئے کہا۔ "جیسے یاد ہے۔"

میں نے ڈیسائر کے کانہ سے پرہا تھر کھا اور بڑے غیر بخوبی بچ میں کہا۔ "وودہ کیا ہے ڈیسائر صاحب۔ نیلا دیوی، آپ کوئی نکرنا کچھے۔ میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے۔"

ڈیسائر نے اپنے صرپ پشاوری نگل کا زاویہ درست کیا اور ویرا (فلم میں نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کچھے بیسے بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

ویرا اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈیسائر درگیا۔ "کیا ہوا اس ویرا؟" ویرا ساڑھی کے آنھل میں ہنسی دباتی بیٹ سے باہر ھلکی ڈینے میں تشویش ظاہر کرنے ہوئے ڈکٹ سے پوچھا۔ "کیا بات ہتھی؟"

ڈکٹ نے اپنا ہنسی سے اُبلتا ہوا منہ درمری طرف کر لیا۔ میں

نے ڈیائی کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا۔ ”تھنگ سیریس - کھانی آنکھی۔“

ڈیائی ہنسا۔ ”اوہ“ پھر وہ مستعد ہو کر اپنے مکالے کی طرف متوجہ ہوا۔ ” یہا دیوی آپ کوئی کھانی نہ یکھئے۔ میں نے بھی دیوی کا...“ اشوک اپنے سر کو لگنے مارنے لگا۔ ڈیائی نے دیکھا تو مستفسد ہو کر اُس سے پوچھا۔ ”کیا بات مسٹر گنگولی؟“

گنگولی نے ایک زور کا متکا اپنے سر پر مارا۔ ”کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا۔ تو ہو جائے ٹیک؟“

ڈیائی نے اپنا کندو سارہ ہلا کیا۔ ”ہو!“

گنگولی نے مردہ آواز میں کہا۔ ”کبھرہ ریڈی —

ریڈی مسٹر جگتا پ؟“

بھونپ سے جگتا پ کی سماں بڑھنائی دی۔ — ریڈی!

گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا —

”ٹارٹ“

کبھرہ اٹارٹ ہوا کلپ پ اٹک ہوئی۔

”میں تھرٹی فور... ٹیک ایون!“

ڈیائی نے راتھل ہراں اور دیرہ ا سے کھانا شروع کیا۔ ” یہا

پانی۔ آپ کوئی دیوی نہ یکھئے میں نے بھی پشاور کا...“

اشوک دیوانہ دار چلا کیا۔ ”مکھی۔ سٹ“

ڈیساں نے رانفل فرش پر رکھی اور کہہ را شوک سے پوچھا۔  
”وہ اینی سٹیک مسٹر گنگولی؟“

شوک نے ڈیساں کی طرف تاکانہ لگا ہوں سے دیکھا مگر فوراً  
ہی ان میں بھیرلوں کی سی زمی اور معصومیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔  
”کوئی نہیں۔۔۔ بہت اچھا تھا۔۔۔ بہت ہی اچھا۔۔۔“ پھر وہ مجرم سے مخاطب  
ہوا۔ ”آؤ منٹو، ذرا باہر ہلیں ب۔۔۔“

سیٹ سے باہر نکل کر شوک قریب قریب رو دیا۔ ”منٹو، بتا دا ب  
یکا کیا جائے۔ صحیح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ پشادر کا پانی اُس کے  
منہ پر چڑھتا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے پنج کے لئے بریک کر دوں ب۔۔۔“

بڑا معقول خیال تھا۔ کیوں کہ ڈیساں سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی  
کہ وہ صحیح مکالمہ بول سکے گا۔ ایک دفعہ اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے  
 تو بڑی مشکل سے ہستی لختی۔ اصل میں اُس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔ اُس سے چھوٹے  
 سے چھوٹا مکالمہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ  
 صحت کے ساتھ ادا کر جاتا تو اُسے محض اتفاق بھا جاتا تھا مگر بطفہ یہ  
 ہے کہ غلط ادایگی کے باوجود ڈیساں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا۔  
 کہ اُس نے مکالمے کو کس حد تک کس روایتیے والی حد تک منع کیا ہے  
 مکالمے کی ٹانگ توڑ کر اُس کو مکمل طور پر اپا، بج کر کے وہ عام طور  
 پر حاضرین کو داد طلب نکالا ہوں سے دیکھا سکتا تھا۔ اُس کی ایک دوڑ کھڑک  
 یقیناً تفریج کا موجب ہوتی تھیں، مگر جب وہ حد سے نجاوہ ز کر جاتا تو سب کے

دل می یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اُس کے سر کے مکملے مکملے کرنیئے جائیں۔

میں فلم ان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈیسائنر نے چار فلموں میں حصہ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس نے ایک مرتبہ بھی پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو۔ اگر حساب لگایا جائے تو آجھانی نے اپنی فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم صنائے کیا ہو گا۔

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیسائنر کی 'ریٹیکس' کارپیکار ڈپچائز ہے۔ یعنی پہلے ٹائمز میں اُس نے ایک بار ایک مکالمے کو چوتھر مرتبہ غلط ادا کیا ہے صرف جو من ڈائرکٹر فرانز اسن ہمیں کا حصہ تھا کہ وہ بہت دیر تک ضبط کئے رہا۔ آخر اُس کا پیانا ذہبی بریز ہو گیا۔ سر پیٹ کر اُس نے ڈیسائنر سے کہا: "مسٹر ڈیسائنر میستی یہ ہے کہ لوگ تمہیں اپنے کرنے میں۔ تمہیں روپے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ورنہ آج میں نے تمہیں ضرور قاتھا گر بہر پھنسنیک رہا ہوتا۔"

اور فرانز اسٹون کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھری ٹیک ہوئے۔ اور اسٹیو کے ہر کارکن کو بارہ باری ڈیسائنر کو دم دلاسا دینے کا فرض ادا کرنا پڑا مگر کوئی چلد کا رگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اُکھڑ جائے تو کوئی دوا یا دعا با اثر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسے وقت میں چنان چہ بھی مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑا فلم صنائے کیا جائے۔ جب اُس کی اور ڈیسائنر کی مرضی بیک

وقت شاملِ حال ہو جائے تو توجہ شکرانہ ادا کرے۔

اشوک نے پنج کے لئے بڑیک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا، بھسی نے ..... ڈیسانی سے مکالمے کے بارے میں گفتگو نہ کی۔ تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے اُس کی یاد تازہ نہ ہو۔ اشوک ادھر اُدھر کی گئیں سناتا رہا۔ ڈیسانی نے حسبِ معمول اپنی طرف سے مزاج انگلیز باتیں کیں، جن میں ذرہ برا بر مزاج نہیں تھا، لیکن سب ہنسنے رہے۔ پنج ختم ہوا۔ اشوک منگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اُس سے پوچھا گیوں ڈیسانی صاحب آپ کو ڈالماگ یاد ہے؟

ڈیسانی نے بڑے و ثقہ کے ساتھ کہا۔ ”جی ہوا“  
لامسِ ادن ہوئیں۔ سین تھری فور، ٹیک تو دشروع ہوا۔  
ڈیسانی نے رانفل برا کر دیرانے سے کہا۔ ”بیلا دیوی... آپ۔ آپ“ اور  
ایک دم رُک گیا۔ ”آنی، ایم سوری!“

اشوک کا دل بیٹھ گیا لیکن اُس نے ڈیسانی کا دل رکھنے کے لئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں جلدی کیجئے۔“

”سین تھری فور، ٹیک تھریں“ شروع ہوا۔ مگر ڈیسانی نے پیشاور سے پیشاپ کو الگ نہ کیا۔ جب چند اور کوششیں بھی بار آور نہ ہوئیں، تو میں نے الگ یجا کر اشوک کو یہ مشورہ دیا۔ ”دادا منی دیکھو یوں کرو۔ جب ڈیسانی یہ مکالمہ ادا کرتا ہے تو وہ کیمرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اس کا یقایا حصہ ادا کرے یعنی پیشاور کا پیشاپ پیاسا ہے، کیمرے

کے سامنے منہ کر کے نہ بولے؟"

اشوک سمجھ گیا۔ کیوں کہ اس مشکل سے نکلنے کی ایک صرف یہی ترکیب تھی۔ کیوں کہ ہم بڑی آسانی سے یہ مکالمہ بعد میں "ڈب" کر سکتے ہیں اگر وہ سارا مکالمہ کچیرے کے سامنے منہ کر کے ادا کرتا تو اُس کے ہونٹوں کی خوبی صحیح مکالے کے ساتھ چپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈیسائی کو یہ ترکیب سمجھائی گئی تو اُسے بہت لھیس پہنچی۔ اُس نے ہم سب کو یقین دلانے کی ہر فکن کوشش کی دہ اب غلطی ہنسنے کرے گا۔ مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اور وہ بھی پشاور کا، اس لئے اُس کی منت سماجت بالکل نہ سُنی گئی۔ بلکہ اُس سے کہدیا گیا کہ جو اس کے دل میں آئے ہوں دے۔

ڈیسائی بہت بددل ہوا۔ لیکن اُس نے مجھ سے کہا۔ "کوئی بات نہیں منٹو۔ میں منہ دوسری طرف موڑ لوں گا۔ لیکن آپ دیکھئے رہ گا کہ میں ڈائیلاگ بالکل کورک بولوں گا۔"

"سین تھرٹی فورٹین" میک فورٹین کی آواز آئی۔ ڈیسائی نے ٹھے عزم کے ساتھ رائل ہوا میں لہرائی۔ اور ویرا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "نیلا دیوی آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے۔"

سین کٹ ہوا۔ ڈیسائی نے فتحندا نہ انداز میں رائل کندھے پر رکھی اور اشوک سے پوچھا "کیوں مرٹر گنگولی؟" اشوک اب بال

نگ دل بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے  
ٹھیک ہے۔“ پھر وہ کیمرہ میں ہر دیپ سے مخاطب ہوا۔ ”پھوٹیکٹ  
شوٹ اے۔“

شوٹنگ ختم ہوئی، مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ چڑھ گیٹ  
جانا تھا۔ اس لئے ہم جلدی جلدی اسٹش پہنچے۔ گاڑی کھڑی تھی۔ ہم ایک  
ڈبے میں بیٹھ گئے۔ سیارہ کیتھے ہیں کہ ڈیساٹ صاحب بھی بر اجان میں اور  
مسافروں کو اپنے۔۔۔ کارنامے نثار ہے ہیں۔۔۔ میرا دوست  
جو اُس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈیساٹ کے پاس بیٹھ گیا۔ دورانِ  
گفتگو میں اُس نے ایک بڑا بیدھب سوال کیا۔

”سیٹ پر جو لوگ ڈائیلاگ بھول جاتے ہیں۔ اُس کا کیا علاج  
کیا جانا ہے۔۔۔“

ڈیساٹ نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں۔۔۔ میں تو ایک دفعہ بھی  
نہیں بھولا۔۔۔“

اُس کا یہ جواب بے حد عصوم تھا۔ جیسے وہ ڈائیلاگ بھول جانے  
کے مرض سے قطعاً نا آشنا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ خود اُس کو کامل بقین  
تھا کہ اُس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اور یہ درست تھا؛ اس لئے  
کہ غلطی کا احساس تو صرف اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر صحت کے  
متلق ہمکا ساتھور انسان کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈیساٹ مر جوم کے  
دماغ میں کوئی ایسا غائزہ ہی نہیں تھا۔ جو غلط اور صحیح میں تیز کر سکے۔ وہ

اس سے بالکل بے نیاز تھا مخصوصیت کی حد تک۔

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مزاح کار تھا۔ یکسر غلط ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کردار کار تھا۔ قطعاً نادرست ہے۔ ایسا گناہ آبجھانی سے کبھی سرزد نہیں ہوا۔ لوگ اگر اُس کی حرکات پر منس ہنس کر دوہرے ہوتے تھے تو اُس کا باعث قدرت کی چھپڑ فانی تھی۔ خداوند نے اُس کی تخلیق ہی ایسے کی تھی جس میں زعفران گندھی ہو۔

ایک رفعہ ریس کورس پر میں نے دور سے اُس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ ”وہ ڈیسائی ہے۔ وہ؟“  
میری بیوی نے اُس جانب دیکھا اور بے انحصار ہتنا شروع کر دیا  
میں نے اُس سے پوچھا۔ ”اتھی دور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنے کی  
وجہ کیا ہے؟“  
وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف یہ کہہ کر  
وہ اور زیادہ ہنئے لگی۔ ”معلوم نہیں“

آبجھانی کو ریس کا بہت شوق تھا، اپنی بیوی اور رٹکی کو ساتھ لاتا تھا۔ مگر دس روپے سے زیادہ کبھی نہیں کھیلا تھا۔ اُس کے پیان کے مطابق کئی جو کی اُس کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ جو اُس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے تھے۔ یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اُس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے تک رکھیں اور کسی کو نہ بتائیں۔

خود کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

رسیں کو رس پر جب میں نے اُس کو اپنی بیوی سے متعارف کرایا۔ تو اُس نے ایک تیشور " یعنی قصینی ٹپ دی۔ جب وہ نہ آئی تو اُس نے میری بیوی سے پُر تعبہ ہلچلے میں کہا۔ " حد ہو گئی ہے ۔ یہ ٹپ تو آنا، ہی مانگنی تھی ۔ " اُس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کھیلا تھا جو پلیس آگئی تھا۔ اُس پر اُس نے بھی قسم سے تعبہ کا انہار نہیں کیا تھا۔ ڈیسائی آبجھانی کی ادائیگی زندگی کے متعلق دو گوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں فتنہ اتنا جانتا ہوں کہ وہ گجرات کے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اُس نے ایل ایل ابی کیا۔ چھ سات برس تک بیبے کی چھوٹی خدا توں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی پریکشہ معمولی تھی۔ لیکن اُس کا گھر پار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی عارضے میں گرفتار ہوا۔ تو اُس کی مالی حالت تپلی ہو گئی۔ ایک عرصہ تک وہ نیم بائکل رہا۔ علاج معلجے سے یہ عارضہ تو دور ہو گیا۔ مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام مرلنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مرض پھر عود نہ کر آئے۔ اب ڈیسائی غریب سے لئے بڑی مشکل تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ دمکات نکلا ہر ہے بیکر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پچھے عرصہ تک وہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ تجارت سے اُسے کوئی روپی نہیں تھی۔ حالانکہ اُس کی رکوں میں ٹھیٹ بھگرا تی خون تھا۔ جب حالات بہت نازک ہو گئے تو اس نے اگر موجودی ڈن کے

چین لال ڈیسائی سے خواہش ظاہر کی کہ اُسے اشٹو میں کام مل جائے  
اصل میں اُس کا مقصد یہ تھا کہ اُسے ایکٹنگ کامو قع دیا جائے جین لال  
گجراتی اور ڈیسائی تھا۔ اُس نے وہی اپنے کو ملزم رکھ دیا۔ اُس کے  
کہنے پر چند ڈاکٹر ڈاون نے آزمائش کے طور پر مختلف فلموں میں تھوڑا  
تھوڑا کام دیا اور اس نتیجے پر پہنچ کر اُس کو پھر آزمائنا بہت بڑی خطا ہے  
چنانچہ دو پکھہ عرصے کے لئے بیکار سا گرمودی ٹون میں پڑا ردیشان  
توڑتا رہا۔

اس دوران میں سٹرہما نورانے ہبے ٹائیز قائم سر پکے تھے جس  
کے متعدد فلم کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ اس ادارے کے متعلق مشہور  
تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ یہ درست بھی تھا۔ چنانچہ ڈیسائی  
تھستہ آزمائی کے لئے دہاں پہنچا۔ دو تین چیز لکانے اور مختلف سفارشی  
خطوط حاصل کرنے کے بعد سٹرہما نورانے سے ملا۔ ہمانورانے  
نے اس کی شکل و صورت اور اُس کی تمام کمزوریوں کو پیش نظر کئے  
جو سے ایک خاص کردار و ضع کیا اور ہندوستانی سکرین کو ایک ایسا  
ایکٹر بنتا جو ایکٹنگ سے باہل نہ آ شناختا۔

پہلے ہی فلم میں وہی، اپنے ڈیسائی فلم بیزوں کی توجہ کا مرکز بن گیا  
جیسے ٹائیز کے عملے کو شوٹنگ کے دوران میں جو مشکلات پیش آئیں۔

دہ بیان سے باہر میں۔ سب کی قوت برداشت جواب دے دے  
باتی تھی۔ مگر وہ اپنے تجربے میں ڈلے ٹر رہے۔ آخر کار کامیاب ہے

اس فلم کے بعد ڈیسائی بیسے ٹائیز کے فلموں کا جزو لا نینک بن گیا؛ اس کے بغیر بیسے ٹائیز کا فلم غیر مختل اور روکھا پھیلا سمجھا جاتا تھا۔

ڈیسائی اپنی کامیابی پر خوش تھا مگر اُس کو حیرت ہرگز نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی کامیابی اُس کی ذہانت و ذکاءت اور انہیک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر خدا یہتر جانتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا اُس کی شہرت، اور کامیابی میں ذرہ برابر دخل نہیں رہتا۔ یہ صرف قدرت کی ستم ڈالی ہتھی کر دہ فلموں کا سبب سے بڑا ظریف بن گیا۔

میری موجودگی میں اُس نے فلمان کے تین فلموں میں حصہ لیا۔ ان تین فلموں کا نام علی الترتیب یہ ہے: ”چل چل رے نوجوان“ ”شکاری“ اور ”آٹھ دن“ ہر فلم کی تیاری کے دوران میں ہم اُس کی طرف سے مستعد دبار مایوس ہوئے۔ مگر اشوك اور مکری چونکہ سمجھے تباچے خیز کر اُس سے کام لینے کے لئے پتا قطعی طور پر مار دینا پڑتا ہے۔ اس لئے سمجھے اپنی جلد گمرا جلنے والی بیعت کو قابو میں رکھنا پڑتا۔ دردناہ بہت یعنی تھا کہ میں چل چل رے نوجوان کی شوٹنگ ہی۔ کے دوران میں دوسرے بھان کو چل پڑتا۔ ویسے کمی کبھی غصے کے عالم میں یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوتی تھی کہ کچھ رہا تھا کہ اُس کے سر پر دے مارا جائے۔ مائیکر دفون کا پورا بوم اُس کے حق میں کھوس دیا جائے؟ اور سارے بلب آتار کر اُس کی لاش پر ڈھیر کر دیئے جائیں۔ مگر جب اس قصد سے اُس کی طرف دیکھتے تو یہ سفا کانہ عزم ہنسی میں تبدیل ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزراً ایل علیہ اسلام نے اُس کی جان کیونکر لی ہو گی کیونکہ اُس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ مگر اُنہوں کا پیٹ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو ڈیساں کی جان لیتے ہوئے وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دو چار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا۔ تو مجھے "شکاری" سا آخری سین یاد آگیا۔ اس میں ہمیں ڈیساں کی جان لینا تھی۔ اُنھیں بے رحم جا پانیوں کے لامتوں زخمی ہو کر مرتا تھا۔ اور مرتے وقت اپنے ہو ہمارشاگر دبادل (اشوک) اور اُس کی محبوبہ دیرا سے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا کہ وہ اُس کی موت پر معموم نہ ہوں، اور اپنا نیک کام کئے جائیں۔ مکالموں کی صحت ادا یگی کا سوال حبِ سمول مشکل تھا۔ مگر اب یہ میہست در پیش تھی کہ ڈیساں کو کس انداز سے مارا جائے کہ لوگ نہ ہنسیں۔ میں نے تو اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ اگر اُس کو پچھ بھی مار دیا جائے تو لوگ نہ ہنسیں گے۔ وہ بھی یقین ہی نہیں گریں گے کہ ڈیساں مرتا ہے یا مر چکا ہے۔ اُن کے ذہن میں ڈیساں کی موت کا تصور آہی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوا مگر مشکل یہ تھی کہ کہانی کا بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا کہ انجام میں اُس کی پرکار موت ضروری تھی جو کہ اُس سے سونپا گیا تھا، کئی دن ہم سوچتے رہے کہ اس مشکل کا کوئی حل مل جانے مگر ناکام رہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں

تھا کہ اُسے مرتا دکھایا جائے۔

مکالموں کی صحت اب ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ جب رپرہ سلیس کی گئیں تو ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ نہایت ہی مفہوكہ خیز طریقے پر مرتا ہے۔ اشوک اور دیرا سے مخالف ہوتے ہوئے وہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں اتھہ ہلاتا ہے، جیسے کوک بھرا کھلونا، اُس کی یہ حرکت بہت ہی خذہ خیز تھی ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے۔ اور اپنے بازوؤں کو جوش دے۔ مگر دماغ کی طرح اُس کا جسم بھی اُس کے اختیار سے باہر تھا۔ بڑی دیرے کے بعد اشوک کو ایک ترکیب سوجھی، اور وہ یہ کہ جب میں شروع ہو، تو دیرا اور وہ دونوں اُس کے اتھہ پکڑ لیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے ایکشان کا سانس لیا۔ لیکن جب پردے پر یہ فلم پیش ہوا اور ڈیساٹ کی موت کا یہ منظر آیا تو سارا حال ٹھہروں سے گونج آئنا۔ ہم نے فوراً دوسرے شوکے لئے اُس کو قینپی سے غفران کر دیا۔ مگر تماشا یوں کے رد عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر اُس کو دیے کا دیسار سنبھال دیا۔

ڈیساٹ آنہماں بے حد کجھوں تھا۔ کسی دوست پر ایک دردھی بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اُس نے قسطوں پر اشوک سے اُس کی پڑائی مورخ خریدی۔ وہ خود چونکہ ڈرائیور نہیں جانتا تھا۔ اس لئے ایک ملازم رکھنا پڑتا۔ مگر یہ ملازم ہر دسویں پندرہ ہویں روز بدل جاتا تھا؛ میں نے ایک روز اُس کی وجہ دریافت کی تو ڈیساٹ کوں کر گیا۔ لیکن بھے

سادنڈر بیکار ڈسٹ بگتاپ نے بتایا کہ ڈیساں صاحب ایک ڈرائیور کھتے ہیں۔ نوٹے کے طور پر اُس کا کام دس بارہ روز دیکھتے ہیں۔ اور پھر اسے "کندھ ملائیں" کے دوسرا رکھ لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چاری رہا۔ مگر اسی دوران میں اُس نے خود موڑ چلانا بیکھ لیا۔

آنہماں کو دسمی کی شکایت بہت عصیتی ہے۔ یہ مرض لا علاج فرار سے دیا گیا تھا۔ کسی کے کہتے پر اُس نے ہر روز دوا کے طور پر خوراکی سی خشک بجنگ کھانا شروع کی تھی۔ اب وہ اُس کا عادی بن گیا تھا۔ شام کو سر دریوں کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگ بھی پیا تھا۔ اور غروب چہکا کرتا تھا۔

"آٹھ دن" میں ایک سین ایسا تھا کہ اُسے پانی کے ٹپ میں بیٹھا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ مگر اُس کی حد سے نازک طبیعت کے لئے ناقابل برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اس کے پیش نظر پانی گرم کرا ریا۔ اور ساتھ ہی پرانی نیجھے سے کہہ دیا کہ برانڈی تیار رکھے، جن اصحاب نے یہ فلم دیکھا ہے۔ اُن کو یہ منظر فردیاں ہو گا۔ جس میں سیم لالہ (ڈیساں) سر زیندر کے ٹیکیٹ کے غسل نہیں میں ٹپ میں بیٹھا ہے۔ سر پر برف کی تھیلی ہے۔ ایکا چھوٹا پانچھا چل رہا ہے۔ اور وہ شراب کے نئے میں دھت یہ کہہ رہا ہے۔ "پاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اور پر برف کا پہاڑ ہے۔" وہیزہ وغیرہ۔

شوٹنگ ختم ہوئی تو جلدی جلدی ڈیساں کے پرٹے تبدیل کرائے گئے، اُس کے بدن کو اچھی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اُس کو ایک پیگ برانڈ

کا دیا گیا۔

یہ اُس کے حلق سے اُتری تو اُس نے بہکنا شروع کر دیا۔ اُنیں تلیں مقداری ہی نے اُسے پورا شرابی بنادیا، کمرے میں صرف میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ مجھے لکھتے بھرے بھجہ میں اپنے تمام کارناموں کی داستان سنانے لگا۔ پچھر یوں میں وہ کیسے مقدار میں رہتا تھا۔ اور کس شاندار اور زود از طریقے پر اپنے موکلوں کی دعائیں کرتا تھا۔

غائب "آٹھوون" فلم انہی کا زمانہ تھا کہ حکومت پنجاب نے زیرِ نفع ۲۹۲ میرے وارثٹ جاری کئے۔ میرے افسلنے "بُو" پر فحاشی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈیساں سے ہوا تو اُس نے اپنی قانونی واقفیت بکھارنا شروع کر دی۔ واقعاً مجھے ایک درجہ پر شرارت سُو بھی۔ وہ یہ کہ اپنے مقدارے کی پیر دی کئے اُسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جب وہ میری طرف سے ہٹیں ہوتا۔ میں نے اس کا ذکر کر جی سے کیا وہ فوراً مان گئے۔ بات واقعی مرے کی تھی۔

گواہوں کی فہرست بنائی تو میں نے انڈین چارلی نور محمد کو بھی اس میں شامل کیا۔ چارلی اور ڈیساں سارے الہور کو عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے، میں اس کا تصور کرتا تو میرے سارے وجود میں ہنسی کا چشمہ پھوٹنے لگتا۔ مگر افسوس کہ شومنگ کی مشکلات کے باعث میرا یہ خواب پورا نہ ہوا۔

ڈیساں نے متعلق واقعہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جو

میرے نزدیک قطعی ضروری نہیں تھیں، اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ فور محمد چارلی نے بھی اپنی گواہی کا فاکہ تیار کر لیا تھا۔ مگر وہ اُدھر بخت میں کچھ اس طرح اپنے فلموں کی شوٹنگ میں صرف تھا کہ ایک دن کے لئے بھی بیسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈیسائی کو انوس تھا کہ اُس کو اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقعہ ملا۔ حکم بخت کی نگاہوں سے یہ باخل اور جعل تھا کہ مجھے اُس کی قابلیت سے کوئی رجسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار یو کھلائے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے بار بار بھوئے۔ پشاور کے پانی کو پیشاب بنانے اور اتنے ریڈیک کرنے کے سب کی لمبیت صاف ہو جائے۔ ڈیسائی مر چکا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار اُس نے ریڈیک ہونے نہیں دیا۔ ریہرل کئے بغیر اُس نے ہزاریں طیہہ اسلام کے حکم کی تعییں کی۔ اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گود میں چلا گیا۔

# تارہ

میں نے اپنی زندگی میں کئی عورتوں کے کردار کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تارہ کے حالاتِ زندگی مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوئے تو میں چکر اگیا۔ وہ عورت نہیں ایک طوفان ہے اور وہ بھی ایسا طوفان جو صرف ایک مرتبہ آکے نہیں ٹلتا۔ بار بار آتا ہے۔ تارہ یوں تو میانہ قد کی عورت ہے۔ مگر بلا کی مضبوط ہے۔ اُس نے جتنی بیماریاں ہیں۔ میرا خیال ہے اگر کسی اور عورت پر نمازیل ہوتی۔ تو وہ کبھی جا بزرہ ہو سکتی۔

میں نے دیکھا ہے کہ صحیح سورپرے اٹھ کر وہ کم از کم ایک گھنٹے تک ریاضت کرتی۔ اور یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہوتی۔ ایک گھنٹہ بھر پور ناچنا ہڑتیوں تک کو تھکا دیتا ہے۔ مگر تارہ مجھے کبھی تھکی دیکھائی نہیں دی۔ وہ تھکنے والی جنس نہیں۔ دوسرے تھک لمر جائیں گے مثغر وہ دیسی کی دیسی رہے گی۔ جیسے اُس نے کوئی مشقت نہیں کی۔ اُس کو اپنے فن سے

پیار ہے۔ اسی والہانہ قسم کا جو مختلف مردوں سے کرتی رہی ہے۔

مسئولی سے دو انس کے لئے وہ آنی محنت کرے گی جتنی کوئی رفاقت عمر بھر نہیں کر سکتی اُس کی طبیعت میں اپنا گھر ہے۔ وہ ہمیشہ کوئی خاص بات پیدا کرنا چاہے گی۔ چلت پھرت جو ایک ٹھنڈی میں ہو سکتی ہے اُس میں زیادہ سے زیادہ موجود ہے۔ وہ ایک سینہ کے لئے بھی پھلی نہیں بیٹھ سکتی۔ اُس کی بولی پوٹی تھرکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی رہنے والی ہے۔ مجھے اس سے متعلق جسمی معلوم پر کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ تارہ کے علاوہ اُس کی دو بہنیں اور تھیں۔ یہ تکون یوں مکمل ہوتا ہے۔ تارہ، تارہ اور الکنڈہ۔ تارہ اور الکنڈہ تو اب قریب قریب معلوم ہو چکی ہیں۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی دیسے بہت رچپ ہے۔ تارہ کی کمی مرد سے داشتگی رہی۔ اس دیوم میں ایک شوکت ہاشمی بھی ہیں۔ جواب تک کمی پاپڑ بیل پکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بیوی پورنیما نے ان سے طلاق لی ہے اور وہ اس سلسلے میں بڑے دردناک بیان دے پکے ہیں۔ الکنڈہ کوئی ہاتھوں سے گزری اور آخر میں پر بھات کے شہرت یا فہر ایکٹر ملبوز نگر کے پاس پہنچی اُس کے پاس وہ ابھی تک ہے یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ ان تینوں بہنوں کی زندگی کی رومندار اگر بھی جائے تو ہزاروں صفحے کا لے کر جا سکتے ہیں۔

تارہ کے متعلق جیسا کہ میں مضمون کے آغاز میں کہہ حکا ہوں۔ پوری

تفصیل سے لکھتے ہوئے جو جگتا ہوں، وہ عورت نہیں کہی عورتیں ہے۔ اُس نے اتنے بنسی سلسلے کے ہیں کہ میں اس مختصر مضمون میں اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

تارہ کا میں جب دھی تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بیسی کی پاپخ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں کہی فلیٹ اور کہی کمرے ہوں اور یہ واقع ہے کہ وہ بیک وقت کہی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب وہ بیسی میں آئی تو اس کا قلعہ ایک گجراتی فلم ڈار کٹ ڈبائی سے قائم ہوا۔

اُس سے میری ملاقات اُس زمانے میں ہوئی جب سر و نج فلم کمپنی زندہ تھی۔ میری اُس کی فوراً اُوس تھی۔ اس لئے کہ وہ فن شناس تھا اور ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اسی دردان میں مجھے معلوم ہوا کہ تارہ اُس کی بیوی ہے۔ لیکن اُس سے جُدا ہو گئی ہے۔ ڈیساں کو مگر اس جدائی کا اتنا رنج نہیں تھا۔ اُس کی باتوں سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اُس عورت سے پورا بیٹ نہیں سکتا تھا۔

تارہ اس زمانے میں کسی اور کے پاس تھی۔ لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر ڈیساں کے پاس بھی آجائی تھی۔ وہ خوددار انسان تھا۔ اس لئے وہ اس سے عموماً بے اعتمانی برستا تھا اور اُسے مختصر ملاقات کے بعد رخصت کر دیا کرتا تھا۔

ہندو نہ ہب کے مطابق کوئی عورت طلاق نہیں لے سکتی۔ اس لئے

اب بھی وہ مسزڈ پیائی ہے۔ حالانکہ وہ بھی مردوں سے منکر ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے۔ میں یہ اُس زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ جب تک مجوب کا تارہ مائل ہے عدنج تھا۔ مجوب نے اُسے اپنے کسی فلم میں لیا۔ تو اُس کے ساتھ تارہ کے بھی تعلقات فوراً قائم ہو گئے۔ اس کی رومندار میرا قسم بیان نہیں کر سکتا۔ صرف ٹپو (عشرت جہاں) کی زبان ہی بیان کر سکتی ہے۔

آڈٹ ڈور شو ٹنگ کے سلسلے میں مجوب کو چیدرا آپا د جانا پڑا تھا۔ وہاں مجوب صاحب حب و ستور باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور تارہ سے عشق فرماتے تھے۔

بھئی میں ایک اسٹیڈیو فلم سی، تھا۔ مجوب نے غائب اسی میں اپنی کوئی فلم بنا کا شروع کی تھی۔ ان دنوں وہاں ساؤنڈریکار ڈسکرنے والے مطر پی این ارڈر اتھے (جواب مشورہ پر ڈیوسری)

ڈائرکٹر مجوب سے تو تارہ کا سلسلہ چل رہا تھا لیکن بقول دیوان شاخ  
مختون ایڈپیریاست دہلي، اس کا ٹانکا پی این ارڈر سے بھی مل گیا۔

ڈائرکٹر مجوب نے فلم ختم کیا تو تارہ پی این۔ ارڈر کے ہاں بطور داشتہ یا یوری کے رہنے لگی۔ لیکن اس دوران میں ایک اور ہادثہ دریش آیا۔ فلم سی ہی میں ایک نووار دالناصر تشریف لائے۔ یہ بڑے خوبصورت جوان تھے۔ کم عمر تازہ تازہ ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کرے۔ کال سرخ و سپید تھے۔ اُن کو شوق تھا کہ علمی دنیا میں داخل ہوں۔

جب آئے تو نور انہیں ایک فلم میں روپ مل گیا۔ اتفاق سے اس کاٹ میں ستارہ بھی شامل تھی جو بیک وقت پی۔ این "ارڈٹا" دائرہ کٹ بھوب اور اپنے خادم سرڑی سائی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔

معلوم نہیں یہ پہلے کی بات ہے یا بعد کی مگر ستارہ کی دوستی نذیر سے بھی ہو گئی۔ جس کی پہلی داشتہ جو کہ ایک یہودی ایکٹریس یا سینمی۔ اُسے داعی مفارقت دے گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ حالات میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان دونوں میں گاڑھی چھپنے لگی۔ نذیر ستارہ کا فرنپت تھا۔ اور ستارہ نذیر پر اپنی جان چھڑ کتی تھی۔

میں نذیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے وہ عورت کو تابع رکھنے کا قائل ہے اور عورت کا ذکر کیا۔ مرد بھی جو اُس کی لازمت میں ہوں انہیں اس کی گالیاں اور گھر دیاں ہنماڑتی ہیں۔

وہ آدمی نہیں دیو ہے۔ لیکن بڑا مخلص دیو وہ میرا دوست ہے جب کبھی مجھ سے مت ہے۔ سلام دعا کے بجائے گالیاں دیتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ بے ریا ہے۔ اس کا دل خلوص سے معمور ہے

اس اپنے ریا اور مخلص آدمی نے ستارہ کو کبھی برس برداشت کیا اس کی سختی گیر غبیعت کے باعث ستارہ کو آئی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے پرانے آشناوں سے راہ درسم قائم رکھے۔ لیکن وہ عورت جو صرف ایک مرد کی رفاقت پر قافی نہ رہتی ہو اُس کا کیا علاج ہے۔ ستارہ نے کچھ دیر کے بعد

وہی سلسلہ شروع کر دیا جس کی وہ عادی تھی۔ اردو ڈرامہ الناصر، محبوب اور خاوند ڈیپانی سب ہی اُس کے اتفاقات سے مستقینہ ہوتے رہے۔ یہ پیغمبر کی خود رار طبیعت پر گران گزرتی تھی۔ وہ ایسا آدمی ہے کہ ایک مرتبہ کسی عورت سے تعلق قائم کر لے تو اُسے بھانا چاہتا ہے مگر ستارہ کسی اور ہی آب و گھل کی بھی نہیں۔ وہ نذیر جیسے آدمی ہے جسی مسلمان نہیں تھی میں اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں رکھتا جو کچھ بھی اس سے سرزد ہوا۔ سر اسر اُس کی جلت کے باعث ہوا۔ قدرت نے اُس کو اس طور سے بنایا ہے کہ وہ بادہ ہر جام ہی بھی رہے گی۔ کوشش کے باوجود دہ اپنی اس فطرت کے خلاف نہیں جاسکتی۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ ساؤں میں بھی پھور ڈر دی چاندرا  
وہاں میں نے آں انڈیا ریڈ یو کی ملازمت اختیار کی۔ قریب قریب ایک سال  
تک میں بھی کی فلمی دُنیا کے حالات و کوائف سے غافل رہا۔ ایک دن  
اچانک میں نے نئی دلی میں اردو ڈر کر دیا۔ ہم اخدمی مولیٰ پھر ڈی۔ کر دو ہری  
ہو رہی تھی۔ یوں بھی بیچارہ منہجی قسم کا انسان ہے۔ مگر اس وقت بہت خستہ  
حالت میں تھا۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا جیسے اُس میں جان ہی نہیں  
میں ٹانگے میں تھا اور وہ پیدل۔ غاباً چہل قدمی کیلئے نکلا تھا۔ میں نے مانگا  
روکا اور اُس سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اُس کا حلیہ کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے  
اُس نے ہانپتے ہوئے مگر ذرا بھی کسی سکراہٹ کے ساتھ کہا "تاؤ  
منڈ ستارہ" میں سب سمجھ گیا۔

اب ایک اور بیفہ مُسٹے، الناصر جواب بہت موڑا اور بھتدا ہو گیا  
جب وہ شروع شروع میں فلم میں آیا تھا تو بہت خوبصورت تھا، بڑا زم  
ونمازک، سرخ دپید، دیرہ دون کی پہاڑی فضائے اُس کو نکھار دیا تھا۔  
میں تو یہ کہوں گا کہ وہ نمائیت کی حد تک خوبصورت تھا۔ اس میں وہ تمام  
ادا میں تھیں جو ایک خوبصورت رہ کی میں ہو سکتی ہیں۔ میں جب دبلي میں ڈری ڈر  
برس گزارنے کے بعد یہ شوکت جسین رضوی کے بُلا نے پڑبھی پہنچا تو اُس  
سے میری ملاقات مزدامودی ٹون میں ہوئی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑا تھا میں  
چرت زدہ ہو گیا۔ کھاؤں کا گلابی زنگ ندارد جسم پر پیلوں ڈھیلی ڈھالی۔  
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مُسٹک رہ گیا ہے پھر ڈیکھ لے۔ میں نے اُس سے بڑے  
شویش بھرے لہجہ میں دوچھا۔ ”میری جان“ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا  
لی ہے؟“

اُس نے اپنا مخفیہ سرے کان کے پاس لاگر سرگوشی میں کہا۔ ”تارہ  
— میری جان سے ستارہ۔“

جہاں دیکھو ستارہ — میں نے سوچا کہ یہ ستارہ صرف زردیاں  
پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ادھر پی این اروڑہ انگلینہ ڈکھانی  
صد اپنڈ، ادھر دیرہ دون اسکوں کا پڑھا ہوا نو خیز رہا۔

الگ یجا کہ جب میں نے اُس سے پوری تفصیل پوچھی تو اُس نے مجھے  
تباہا کہ وہ ستارہ کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ جس کا نتھی یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا  
جب اُس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اس چکر میں رہا۔

تو وہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ ایک روز تھٹ کٹا کر ڈیرہ دون چلا گیا۔ جہاں اُس نے تین ہیئتے ایک سینی ٹوریم میں گزارے اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کی قدر حاصل کی، اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اس دوران میں مجھے ہندی زبان میں بڑے لمبے لمحے خط لکھتی رہی۔ لیکن میں یہ خط پڑھ نہیں سکتا تھا۔ البتہ ان کی آمد سے کانپ کانپ ضرور جاتا تھا۔ اُس نے پھر میرے کان میں کہا۔

**مٹو صاحب ابرٹی عجیب و غریب عورت ہے ॥**

تارہ اصل میں ہے ہی عجیب و غریب عورت۔ ایسی عورت ملے لا کھد میں دد تین ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھئی مرتبہ خطرناک طور پر بیمار ہوئی۔ اُس کو ایسے عارضے لاحق ہوئے کہ عام عورت کبھی جائز نہ ہو سکتی۔ مگر وہ ایسی سخت جان ہے کہ ہر بار موت کو غصہ دیتی رہی۔ اتنی بیماریوں کے بعد خیال تھا کہ اُس کے ناقچے کی قوتیں سلب ہو جائیں گی۔ مگر وہ اب بھی اپنے عہد جوانی کی طرح ناچھتی ہے۔ ہر روز کھنوں ریاض کرتی ہے۔ ماشیتے سے یتل کی ماش کرتی ہے۔ اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو پہلے کرتی آئی ہے۔ اُس کے گھر میں دونوں کر تھے میں ایک مرد ایک عورت۔ مرد عام طور پر اُس کا ماشیا ہوتا ہے جو عورت پر اُس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ پرانی کہانیوں کی کئی معلوم ہوتی ہے جو آسمان میں تھنگی لگایا کرتی تھیں۔

جب تارہ اکھیلی تھی۔ یعنی وہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہتی تھی۔ تو اُس کا بیان دادر کے ”خداداد سرگل“ میں تھا۔ اور جو صفتیں یا قیاحیں تارہ میں

زدہ بیان داد دیں۔ نذر پر جواب سوران تا سے ملک ہے۔ بڑی فریوں  
لگ ہے۔ اُس نے بہت دیر تک ستارہ کو برداشت کیا مگر بیساکھ میں پیش  
کر لکھا ہوں وہ ایک مرد کی عورت نہیں ہے۔ چنانچہ جب نذر تک آئی  
ڈائیں کو جتنی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے بناہ نہیں کر سکتا۔ تو اُس نے ایک  
ڈائیں سے ہم ترجیح دیکھ دی۔ ستارہ مجھے بخش دو، مجھے غلطی ہو گئی جس اس  
لئے پیشان ہوں۔ اور تم سے معافی کا خواستگار ہے؟

نذر ستارہ کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا۔ وہ اُس سے ناخوش نہیں تھیں ایسی  
لذتیں دو گوب سے ایک فاص قسم کی بھی لذت صورت کرتی ہیں۔ محرمان  
فسلک مرد کب تک ہاتھا پائی کرتا رہے وہ غریب بھی ایک مرد سے کہ بعد عاجز  
ہوئے۔ اب اسی سلسلے کی ایک اور کڑا ہی کے متعلق بھی سنئے۔

جس زمانہ میں ستارہ نذر کے یہاں تھی۔ اُسی زمانہ میں نذر کا بھاگی  
لف بھی دیکھا تھا۔ کے آصف پڑا تنو مندر جوان تھا۔ پڑا ہٹا کن جوانی  
ہر رور۔ جس کو عورت فدا تھتے شاید کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اپنے  
لار کے ہاں رہتا تھا۔ اور اُس سے نکلی صفت کے متعلق واقعیت حاصل  
کا تھا۔ دل میں سینکڑوں دلوں تھے۔ پڑے اہمان تھے۔ پھر فلمی دنیا  
اگر اُس نے خور قوں (اور وہ بھی ایکرڈسون) کو قرب سے دیکھا تھا۔ اس  
کے لاماؤہ اُس نے اپنے ما موں نذر اور ستارہ کے باہمی تعلقات بھی اپنی آنکھوں  
خوبی کے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کے آصف کی جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔ یہ  
کھوڑ تھا جب مرد اپنی جوانی کے جوش میں پھر دل کی دیوار سے بھی بھڑ

جانا چاہتا ہے۔ اور تارہ یقیناً ایک پھر می دیوار بھی جو کسی سے نکرنا پا چاہتی تھی۔

ندیمہ اس زمانے میں رنجت فلم اسٹڈیو کے عین سامنے ایک اصل لئے کے اندر رہتا تھا۔ بڑی غلیظ سی جگہ تھی۔ ندیمہ نے ایک پورا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اُسی میں اُس کی قائم کی ہوئی "مہینہ بھر ز" کا دفتر بھی تھا۔ دو تین مگرے تھے اُس میں تخلیہ کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ پر جوش نوجوان آصف کو ہر دوہ پہلو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ جو مردوں کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہوتا ہے۔

نوجوان آصف کے لئے ایک نیا بھرپور تھا۔ بڑا حیرت انگریز۔ اُس نے اپنے شادی شدہ روستوں سے ازدواجی زندگی کے اسرار کئی بار سُننے تھے۔ مگر اُس سے کبھی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا ایک بستر ہوتا ہے جس پر انسانی فطرت اپنا ازلي دا بدی کھیل کھیلتی ہے۔ مگر آصف کی آنکھوں نے جو کچھ ایک بار مخفی اتفاق سے دیکھا۔ وہ بالکل مختلف تھا۔ بڑا خوفناک جس نے اُس کی ہڈی ہڈی جھنگھوڑ دی۔ اُس نے کئی بار کتوں کی رٹائی دیکھی تھی۔ جو ایک دوسرے سے بڑے دختناک طریقے پر کتھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھنگھوڑتے، بھنجھوڑتے اکاٹتے اور نوچتے تھے۔ اس کا تن بدن لرز گیا۔ اُس نے سوچا یہ محبت و جنت سب بکواس ہے۔ اصل میں نہ درندہ ہے۔ اور اُس کی محبت ایک خوفناک قسم کی کشتی، مگر اُس کو اکھاڑتے میں اُترنے اور ایسی کشتی لٹانے کا شوق ضرور تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت تھی۔ اُس کے بدن میں حرارت تھی۔ اُس کے تمام پیغام فولادی تھے۔

اُس کی خواہش تھی کہ صرف ایک بار اُسے موقعہ دیا جائے۔ تو وہ حریف کو چاروں شانے چت مگر ادا کرے۔

اس زمانے میں ڈاڑھر نبیر (ایک ذہن مگر بد قسمت ڈاڑھر) بھی نذیر کے ساتھ تھا۔ آصف اور وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کو اوارے اور خوابوں کی دینا میں رہنے والے، آپس میں ملتے تو وہ عورتوں کی باتیں مگر تے، ان عورتوں کی جو مستقبل میں اُن کی ہوئیوں والی تھیں۔ پر جب ستارہ کا ذکر آتا تو دونوں کا پا اُٹھتے۔ اور ایک ایسی دینا میں پلے جاتے بہاں جن، دیو اور چڑھیں رہتی ہیں؛ لیکن اُن کو اتنا معلوم تھا کہ ستارہ نذیر کے ساتھ دفاردار نہیں۔ وہ ہر جانی ہے۔ یوں تو نذیر کی بول ٹانگ، واٹھ کے طور پر رہتی ہے۔ مگر پی۔ این ارد ڈھ کے پاس بھی جاتی ہے۔ اور بھی بھی دیساں کے پاس بھی جو بیچارہ بڑے حسرت کے دن گزار رہا تھا۔ اور پھر اور بھی تھے جن میں ان صربھی شامل تھا۔

صحیح سویرے ستارہ اٹھتی اور دوسراے کمرے میں ریاض شروع کر دیتی یہ بھی ایک حیرت ناک چیز تھی کہ صحیح اٹھتے ہی لگاتار دشیوں کی ماتنہ ناچھتی رہے ایسے ایسے توڑتے لے کہ زمین گھوم جائے۔ ہلبی کے لہوش ہو جائیں مگر اُس سے کچھ نہ ہو۔ ریاضت کے بعد وہ اپنے ایک خصوص مالیثیے سے ماش کرتی تھی۔ اُس کے بعد نہادھو کر دہ نذیر کے کمرے میں جاتی جو کہ سورہ ہوتا۔ اُس کو جگاتی اور اپنے ہاتھ سے دودھ یا خدا معلوم کس چیز کا ایک پیالہ اے نذر دستی پلاتی۔ اور ایک دوسرانما پاچ شروع ہو جاتا۔ یہ سب کچھ آصف

اور نیڑ کی آنکھوں کے سامنے ہورتا تھا۔ ان کی عمر تجسس کی عمر تھی۔ جب آدمی خالی کمر دل میں بھی خواہ مخواہ کھڑکی کی درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ روشن داؤں سے بھرے کمر دل کا جائزہ لیتا ہے۔ ذرا سی آواز آئے پر۔ اُس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان میں معافی بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیڑ آصف کے مقابلہ میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ اس کی جسمی خواہیں بھی اسی لحاظ سے معتدل تھیں۔ مگر آصف کے مضمون اور تمدن جسم کی رگ رگ میں بھلی بھری ہوئی تھی جو کسی پر گزنا چاہتی تھی۔ اسی لئے آصف چاہتا تھا کہ اندھیری رات ہو، آسمان پر کالے بارلوں کا بحوم ہو۔ کان بھرے کر دینے والی بھلی کی کڑک اور طوفان باد دباراں میں وہ کسی کا باہم مضمون سے پکڑ لے اور اُسے مضبوطی سے کھینچتا کہیں دور لے جائے جہاں پھر دل کا بستر ہو۔

نذر کا عزیز ہونے کے باعث تارہ گھنٹوں آصف کے پاس بھی رہتی اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں، جوں جوں وقت گزرتا گیا آصف کا حجاب کم ہوتا گیا۔ مگر اس کو اتنی برات نہیں تھی کہ وہ تارہ کو ماٹھ لے لگا۔ یکوں کہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے دا قف تھا، اور اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن اس دران میں آتنا جان گیا تھا کہ تارہ اس کی طرف مائل ہے۔ وہ جب بھی چاہے اُس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اُسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات۔ وہ طوفان بادو باراں اور وہ پھر دل کا بستر۔!

بالآخر تارہ کے کرتوت دیکھ کر نذیر بھوپنچھارہ گیا  
 نذیر کے سر سے اب پانی گزر چکا تھا۔ کافی لعن طعن سے بعد اُس  
 نے تارہ سے کہا کہ اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بسترد گول آردو۔  
 ستارہ، کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات ہے۔ نذیر کی سرزنش کے  
 بعد اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اکیلی اپنا بسترد گول کر سکتی۔ نذر سے  
 وہ کیسے مدد مانگتی۔ وہ غصے میں بپڑا، منظر میں جھاگ۔ کالتا باہر نکل سرپسند  
 دفتر میں جا بیٹھا۔ اصف نے اُس کے یہ تصور دیجئے تو اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ  
 اندر ہیری رات آگئی۔

لحوڑی دیرہ دہ فاہم شش بیجھارہ۔ اُس کے بعد انھما اور آہستہ آہستہ  
 دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں تارہ پلٹاک پر بیٹھی اپنی چوڑیں سہلا رہی تھیں  
 چند باؤں ہی سے اُس کو معنوں ہو گیا کہ معاملہ ختم ہے۔ دل ہی دل  
 وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اُس نے تارہ کو دھارس دنی۔ کچھ اس طور پر  
 کہ ایک بیاما معاملہ مژدع ہو گیا۔

اس نے اُس کا بستر پوریا باندھا۔ اور اُس کے ساتھ اُس کے گھر  
 داقع دادر (خداداد سرکل) چھوڑنے لگا۔

یہاں تارہ نے اصف کا بہت بہت شکر یہ ادا کیا۔

اس نے جرارت سے کام لیکر تارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔ "اُس کی یہاں  
 ضرورت نہیں تارہ۔"

تارہ نے اپنا ہاتھ اصف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ

آصف مسلمن نہ تھا۔ مختور ٹری دیر راز دنیا زکی باتیں ہوئیں۔ تارہ نے آصف کو اپنے اس سحر کا نونہ چلھایا، جس سے وہ اس وقت تک سینکڑوں مرد، دبليے پتليے، ہٹے کئے، خدی اور خشی اپنی خواہشات کا غلام بننا چکی تھی۔ اگر دن ہوتا تو آصف کو یقیناً تارے نظر آ جاتے، مگر رات کو اُس سے خدا واد سرکل کے اس نیلگی میں دن طلوع ہوتا نظر آیا۔ اُس کی ستر توں کا دن۔ مگر دہ پھر بھی مسلمن نہیں تھا۔ اُس نے تارہ سے کہا کہ دیکھو، تمہارا میرا سبندھ بہت سببودھ ہونا چاہیے۔ ہر جائی پن چھوڑ دیں، بس ایک کی ہو جاؤ۔

تارہ نے اُس سے تین دلایا کہ وہ آصف کے سوکھی کی طرف آنکھ انٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ آصف مسلمن ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ نذر اُس سے اتنی دیر لکانے کی وجہ نہ پوچھ بیٹھے۔ عاشق صادق کی طرح اُس کا ہاتھ چوم کر چلا گیا، اور دعوہ کر گیا کہ دوسرے روز فرور آئے گا۔

وہ گیا، تو تارہ اٹھی، سنگار میز کے پاس جا کر اُس نے اپنے بال فست کئے۔ سارہ می بتدیل کی اور کسی کی طرف آنکھ انٹھائے بغیر نیچے اُڑی اور کسی لے کر پی اپنے اور دڑھ کے پاس پلی گئی۔

جلد معرضہ ہے۔ لیکن ہوا کرے۔ کہنا یہ ہے کہ تارہ کو مجھ سے سخت نظر تھی۔ میں مصور کا ایڈیٹر تھا اور بے لگ کر لکھتا تھا۔ بال کی کھال، اور نت نت کے کالموں میں کئی بار میں نے اُس کی درگت بنائی تھی۔ لیکن بڑے سلیقے سے۔ اس میں کوئی سو قیانہ پن نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ناراض ملتی۔ اور مجھے اس ناراضی کی پچھئے تو کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اس نے کہ مجھے اُس سے کوئی عرض نہیں ملتی۔

اور یوں بھی فلمی ہستیوں سے دُور دُور ہی رہتا تھا۔

میں نے نت نی "یا بال کی کھال کے کاموں میں جب نزیر اور اُس کی لڑائی کا ذکر ذرا نمک مرچ لگا کے یا تو وہ بہت بخ پا ہوئی اور اُس نے مجھے خوب خوب گالیاں دیں۔

اس کے بعد جب مجھے اپنے جامسوں کے ذریعے سے آصف اور اُس کے خیزہ معاشرے کا پتہ چلا۔ اور میں نے پچھتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اس کا ذکر اپنے کاموں میں کیا تو وہ بخنا کئی اور اُس نے آصف سے کہا: "تم اس شخص کو پیش کیوں نہیں، خود نہیں پیش تو کسی سے پرواہ۔ یا کسی اور اخباروں کے کو کہ دہ اسے اپنے اخبار میں دھیر دیں کے دھیر کا لیاں کھایاں دے۔ آصف بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ ان میں بُر دباری ہے۔ تحمل ہے مذاق بمحنت کی اہلیت رکھتا ہے۔ اُس نے ستارہ کی باتیں اس کان میں اُس کان نکال دیں۔

معاملہ اب نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ستارہ کس قسم کی عورت ہے۔ اگر اُس سے کسی مرد کا واسطہ پڑ جائے تو اُس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ نقطہ ایک انسانی بھروسہ چند ماہ اُس سے کے ساتھ گزار کر دیکھ دوں بھاگ گیا۔ ورنہ ایک روز اُس کی انٹریاں پاٹھل جواب فی دستیں اور اُس کی قبر بیٹی کے کسی قبرستان میں بنی ہوتی۔ جس کے سمتے پر کچھ اس قسم کا شعر مرقوم ہوتا ہے

لحمد پر میری دہ پردہ پوش آتے ہیں چراغِ گور غریبان، بہا بجھادینا

ہاں تو معاملہ بہت نزاکت انجیسٹار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ نذری کے دل میں شکوک پیدا ہو ہے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ یہ میرا بجا بجا آئی اتنی دیر کہاں نا۔ رہتا ہے۔ جب وہ اُس سے پوچھتا تو وہ کوئی بہانہ پیش کر دیتا۔ مگر یہ بہانے کب نکل پڑتے۔ ان کا اٹاس ایک روز ختم ہونا ہی تھا۔ نذری کے دل میں تارہ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایسا ادمی نہیں کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔ اُس کو ستارہ کی نہیں آصف کی فکر تھی کہ وہ کہیں اُس کے لئے نہ پڑھ جائے۔ وہ اس عورت کے ساتھ کئی برس گزار چکا ہے اُس کی رُگ رُگ اور نخ نخ سے واقف تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ آصف بیہ نوجوان اُس کامن بھاتا کھا جا ہیں۔ اور ان کو اپنے دام میں پھنسانا اس ایسی تجربہ کا ر عورت کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ خود بخود اُس کے دام کے نیچے آ جاتے تھے۔ ایک بار چھپس جاتے تو رہائشکل ہو جاتی تھی۔

ستارہ سے کسی مرد کا سابقہ پڑ جائے اور اتفاق سے وہ ستارہ کو پسند آجائے تو پھر دن اور رات کا بیشتر حصہ اُسی کے ساتھ کا ٹناؤڑا تا ہے۔ نذری کو آصف کی پے در پے غیر حاضر ہیں ہی سے پتہ چل گیا تھا۔ مگر جب آصف کہتا کہ ماں جان یہ آپ کی کہہ رہے ہیں۔ میں اس کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا تو وہ شش دفعہ میں پڑ جاتا۔ لیکن دل میں اُس سے پورا یقین تھا کہ یہ لوڈا چھپس چکا ہے۔ اور جھوٹ بول رہا ہے۔

آصف والی جھوٹ بول رہا تھا۔ معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہوگا۔ تو وہ

یقیناً بھی جھوٹ نہ بولتا۔ مگر تارہ اُس کے ماموں کی داشتہ تھی: اُس کے ساتھ وہ ایسے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تعلقات جو قائم ہو پکے رہتے۔

بھیجے ہُندا اور فرار اپ بہت مشکل تھا اُصف اس "زن تسری پا" کی گرفت میں تھا۔ بھاگ نہ لئے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر ادھرنڈیر کی آنکھوں میں برابر خون اُتر رہا تھا۔ اُس کوں ایک موقع چاہیئے تھا۔ ایسا موقع کو وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایک روز نذریز نے وہ سب کچھ دیکھ بھی لیا جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا حافظہ میرا ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے سارے داقعات اچھی طرح معلوم تھے۔ مگر اب اتنا عرصہ گذر گیا ہے کہ بہت سی بائیں ذہن سے اُتر گئی ہیں۔ وہ خون جو نذریز کی آنکھوں میں ایک عرصے سے اُتر رہا تھا۔ وہ اس وقت پی گیا۔ اور ان پر ٹوٹ پڑا۔

آصف نے اپنے ماموں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا رشتہ، ایسا کوئی تعلق نہیں جس کے لئے انہیں مور دعا تاب بنایا جائے۔ لیکن نذریز اس وقت کچھ بھی مُنْعِنَ کے لئے یتار نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مار مار کے ان دونوں کی ہڈی پسلیاں توڑ دینا چاہتا ہے۔ تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو، مگر مجید (مشہور ایک مذہبی پاکستان میں ہے) نے بڑی ہو شیاری سے بیچ بچاؤ کر دیا۔

اس حادثے کے بعد آصف اور تارہ کے درمیان کچھ دیر باشیں ہوئیں۔

ددے دعید ہوئے۔ قسمیں کھائیں کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جُدَا نہ ہوں

گے۔ ویزہ دیگرہ۔ اس کے بعد آصف نے پئے عاشقوں کے اندازیں تارہ سے رخصت لی۔ اور چلا گیا۔

تارہ نے اپنا میک آپ درست کیا۔ نئے گھر پہنچنے اور میکی منگو اکر پی، این اردڑہ کے پاس چلی گئی۔ جس کی صحت دہلی کے حکیموں کے علاج سے اب کسی قدر بجا ہو چکی تھی۔ اور اُس کے پچکے ہوئے ہنگاؤں میں تھوڑا سا گوشت آگیا تھا۔

ہمایا جاتا ہے کہ نذیر نے ایک بار پھر چھاپ مازا اور دد نوں کو یعنی موقع پر چاپکڑا۔ اس دفعہ کیس نے بیچ بچا دیکیا۔ اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ بہر حال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کیونکہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلا دیا کہ اُس کے اور تارہ کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ بہر حال آصف اور تارہ کے سرے آئی بیا ایک دفعہ پھر ٹھیک ہو گی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز آصف غائب ہو گیا دوسرے دن معلوم ہوا کہ تارہ بھی غائب ہے۔

مجھے معلوم نہیں وہ دو نوں کہاں گئے تھے۔ مگر دہلی سے خبر موصول ہوئی کہ تارہ مشرف ہا السلام ہو چکی ہے۔ اور اُس کا اسلامی نام اللہ رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ آصف نے اُس سے باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے۔

جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو میں نے مصوّر کے کالموں میں جی مجرکے لئے قریب قریب ہر ہفتے اس نے بیا ہتا جوڑے کا ذکر ہوتا۔ برڑے لہنزی پر مذکوٰۃ اور فکاہیہ انداز میں۔

ماہ عسل یعنی ہنی مون منانے کے بعد یہ جوڑا جب بھی داپس آیا تو نذیر خون

کے گھوٹ پی کر رہ گیا۔ ایک دفعہ مجھے ریس کورس جانے کا اتفاق ہوا میں نے دُور سے دیکھا کہ بجوم میں سے آصف شارک سکن کے بے رانے سُوٹ میں بلوس، پھر تلی ستارہ کی کریں ہاتھ دینے پڑا آ رہا ہے۔ جب وہ میرے قریب چہنچا۔ تو وہ پہلے مسکرا یا۔ پھر ہنسا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر لپٹنے لگا۔ «بھی خوب ہے۔ بہت خوب۔ نک مرچ اور بال کی کھال کے کالموں میں تم جو کچھ لکھ رہے ہو خدا کی قسم لا جواب نہ ہے۔»

ستارہ یوری چڑھا کر ایک طرف بہت گئی! مگر آصف نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور مجھے بڑے بلند بانگ فلوس کے ساتھ دیر تک باشیں ہرتا رہا۔ میں اس سے پیشہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ بڑے طرف کا آدمی ہے۔ اور من اور نکاح بھجنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

بہر حال جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آصف، ستارہ سے قانونی طور پر شادی کر چکا تھا۔ مگر ایک عرصے کے بعد جب میں نے اُس سے پوچھا "کیوں وھاں نو کیا دافعی ستارہ تمہاری منکوڈ یوں ہے؟" تو وہ ہنسا "کیا انکاج اور کیسی شادی؟"

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہے۔ آصف کا اپنا کوئی بھی مکان نہیں تھا۔ بس دنوں وہیں خدارا دسکل (ردائی) میں رہتے تھے۔ اور کھلے بندوں رہتے تھے۔ ستارہ کی سورڑتھی۔ اُس سے میں گھومنتے تھے۔

ایک زمانہ گزر گیا۔ آصف اور ستارہ میاں یوں کی زندگی گزار رہے

تھے۔ مگر یہاں مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔

جس زمانے میں آصف سے میری دستی نہیں تھی۔ اور اُس کا تعلق بھی تارہ کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔

کے آصف صاحب کے چہرے پر بلا مبالغہ دس ہزار کیلیں تھیں اور اتنے ہی ہماسے تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ جوانی کی نشانیاں ہیں۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر جوانی کی نشانیاں آئی بد نہما اور مختلف دیں تو خدا کرے کسی پر جوانی نہ آئے۔

میں جب اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا جو کہ بلا مبالغہ خانہ زبور دکھانی دکھائی دیتا۔ تو مجھے بڑی کوئت ہوتی۔ میں نیم حکیم بھی ہوں۔ اپنی دانت کے مطابق اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے بھی دو ایں خرید کر اُس کو دیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیلیں اسی طرح موجود تھیں۔ مگر جب تارہ اُس کی زندگی میں آئی تو چند ہمینوں کے اندر اندر اُس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا۔ صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔

بہت دیر تک تارہ اور آصف اکٹھے ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے اب دو نوں غائبًا ماہم کے ایک فلپٹ میں رہتے تھے۔

مجھے یہاں جانے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ اُن دنوں آصف 'پھول' بنانے کے بعد غائبًا، انارکلی، بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی کہانی کمال امر وہی نے لکھی تھی۔ مگر وہ شاید اُس سے مطلقاً نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو دعوت دے چکا تھا۔ کہ وہ اس میں کچھ جدت پیدا کریں۔ میں بھی اُن ہی لوگوں میں سے

ایک تھا۔

میں عام طور پر صحیح آنٹھبے کے قریب وہاں پہنچتا۔ دروازہ ایک بڑا چینا گھولتی۔ جو مل کی باریک ساری ہی پہنچنے ہوتی۔ اُسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ دروازہ الف بیل کی کسی کٹانی نے کھولا ہے۔

میں اندر جاتا اور صوفی پر بیٹھ جاتا۔ ساٹھ دالے کرے سے جو غاباً خواب کاہ تھی۔ ایسی ایسی آدازیں آئیں کہ روح لرز لرز جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُصف نمودار ہوتا۔ حسب عادت اپنے ہونٹ چاٹھتے ہوئے۔ اُس کی ہیئت کزانی دیکھنے کی چیز تھی۔ مل کا کڑہ بلکہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ گردن اور سینے پر نیل پیٹ میں۔ بال پریشان ہیں۔ سانس پھولی ہوئی ہے۔ سہولی علیک سلیک ہوتی۔ اور وہ فرش پر ڈھیر ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ، آصف کے لئے ایک پیالہ بھجتی جس معلوم ہنسیں کسی چیز کی کیھر ہوتی۔ آصف آہستہ آہستہ بادلنا خواستہ پیالہ ختم کرتا۔ اس کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے۔ جو زیادہ تر گھنی پر مشتمل ہوتا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ ستارہ اور آصف کے تعلقات بڑے مستحکم نظر آتے شے۔ مگر ایک دم جائی نہ کیا ہوا کہ یہ سُننے میں آیا کہ آصف اپنے عزیزوں میں کسی رُلکی سے شادی کر رہا ہے۔ عماری کی پکی ہو گئی۔ اور وہ عنقریب اپنے دوستوں کے ساٹھ لا ہو رہا نہ ہو نیوالا ہے۔

اُس کے بعد اطلاع ملی کہ لا ہو رہیں اُس کی شادی بڑے ٹھاٹتے ہوئی۔ خم کے خم لندھائے گئے۔ بھرے ہوئے اور راگ رنگ کی کئی مخفیں

جمیں۔ پھر تاکہ آصف اپنی نئی نویلی دہن کے ساتھ بھی لپٹنے چکا ہے۔ یہ شادی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ آصف نے اپنی پیوی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ناچاقی ہوئی۔ اُس کے بعد تپہ پلاگ کے طلاق ہوا۔ والی ہے۔ اور اس دوران میں آصف برابر ستارہ کے یہاں جاتا تھا۔

آصف نے بیاہ کیا۔ لاہور میں بڑے ٹھاٹ کی محلیں جیسیں، اُس کے بعد آصف اپنی بیوی کو بھی کر بھی آیا۔ پالی ہل پر ٹھہرا اور دو تین چینیں کے اندر اندر اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ ستارہ کے سوا ادر کیا ہو سکتی تھی۔

ستارہ مردم شناس عورت ہے۔ اُس کو دہ تمام ڈھب آتے ہیں جو مرد کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ مگر یوں کہیے کہ دسری عورتوں کے لئے بالکل ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ بھی وجہ ہے کہ آصف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور ستارہ کی آغوش میں چلا گیا۔ اس لئے کہ اس میں کشش تھی۔

میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آصف بڑے طرف کا آدمی ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہنسیں ہو گا۔ ستارہ نیقیناً ناراض ہو گی۔ مگر وہ مجھے تھوڑی دیر سے خوش دے گی۔ اس لئے کہ اس کا طرف بھی چھوٹا نہیں ہے۔ وہ بڑی قد آور عورت ہے۔ (حالانکہ اُس کا قد بہت پست ہے)۔ وہ مجھے نہ معلوم کیا آدمی۔ بھائی ہے۔ مگر میں اُس سے بحثیت ایک عورت کے ایسی عورت سمجھتا ہوں۔ جو حوال میں شادہ ایک مرتبہ پیدا ہوتی ہے۔